ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۳۰ ستمبر ۔ ۷ اکتوبر ۱۹۷۱ء

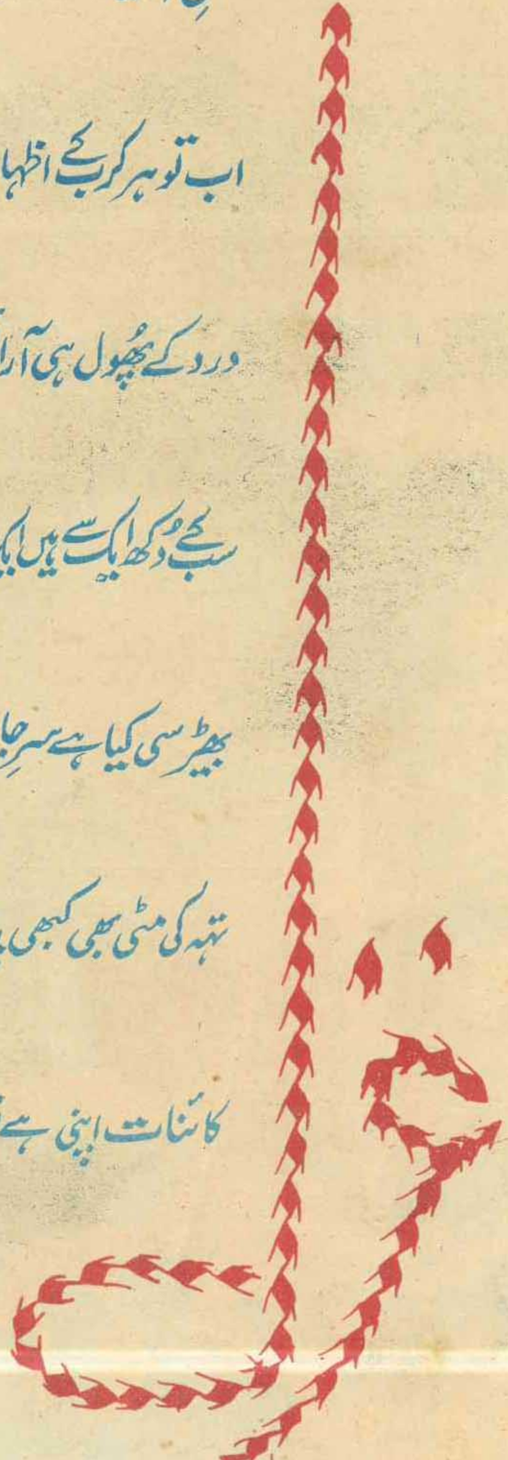
افکارِ ماؤ سے انقلاب کا راستہ متعین ہوتا ہے

چینی انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر خصوصی مضامین اور تصاویر اندر ملاحظہ فرمائیں



قیمت :۔ ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے :۔ ۷۵ پیسے

مجید شاہد



عکسِ آئینۂ ایّام کو سچّا سمجھو
اپنے چہرے کو سدا اپنا ہی چہرہ سمجھو

اب تو ہر کرب کے اظہار کی آزادی ہے
اب تو ہر زخم کو یارو لبِ گویا سمجھو

درد کے پھول ہی آرائشِ جاں کرتے ہیں
ہر نئے زخم کو طبیعت کا تقاضا سمجھو

سب کے دکھ ایک سے ہیں ایک سے غم ہیں سب کے
راہ چلتے ہوئے ہر شخص کو اپنا سمجھو

بھیڑ سی کیا ہے سرِ جادۂ منزل دیکھو
شور کیسا ہے سرِ بزمِ تمنّا سمجھو

تہہ کی مٹی بھی کبھی پاؤں پکڑ لیتی ہے
لاکھ پایاب ہو دریا، اُسے دریا سمجھو

کائنات اپنی ہے شاہدؔ یہی ٹوٹا ہوا دل
مشتِ خاک اس کو نہ جانو، اُسے دُنیا سمجھو

جمہوریت کی بحالی دسمبر تک

چند ہفتوں سے محلاتی سازشوں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ غیر یقینی حالات بدستور قائم ہیں۔ عوام پریشان ہیں کہ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ بھٹو صاحب نے مطالبہ کر دیا ہے کہ ۷۲ء کا آغاز جمہوریت کی بحالی سے ہونا چاہیئے۔ ورنہ ملک کی سالمیت کو شدید خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اقتدار چاہے جس کو دو، جمہوریت بحال کر دو۔

اس مطالبے کی روشنی میں سیاسی مبصرین نے قیاس آرائی کی ہے۔ کہ "دسمبر کے مہینے میں جمہوریت بحال ہو جائے گی، صدر یحییٰ سے سیاسی رہنماؤں کی ملاقاتیں نیتجہ خیز ثابت ہوئی ہیں۔ وہ لوگ جو لفافے کھول کر بیانات دیتے ہیں انہوں نے بھی اقتدار کے انتقال کی حمایت کر دی ہے۔

عوام آج کل انتخابات کے زمانے سے زیادہ ملک کے سیاسی حالات میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ اس منظم سازش کا بغور جائزہ لے رہے ہیں۔ جس کے تحت ملوں اور کھیتوں سے چھانٹی ہو رہی ہے۔ روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، فاقہ کش محنت کاروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نوکر شاہی کے مظالم بڑھ رہے ہیں۔

عوام یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ مذکورہ کارروائیاں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو بچانے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ عوام کا فیصلہ اس نظام کے خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ۷ دسمبر کے عام انتخابات میں موجودہ سامراجی اور سفاکانہ نظام کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ پاکستان عوام کی ملکیت ہے۔ یہاں وہ نظام نہیں چل سکتا جو گنتی کے چند خاندانوں کی پرورش کرے اور کروڑوں بھوکوں مر جائیں ایسا نظام رائج کیا جائے جو گنتی کے خاندانوں کو ختم کر کے عوام کو خوشحال بنائے۔

اس فیصلے کے باوجود وہ دیکھ رہے ہیں کہ لاہور چھاؤنی کی پولیس ایک کارکن یعقوب کو اپنی وحشت کا نشانہ بنا کے ہلاک کر دیتی ہے۔ عوام اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ تو آنسو گیس اور لاٹھی چارج سے آؤ بھگت ہوتی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد واقعہ نہیں، عوام کی نظریں شمالی ہشت نگر کے کسانوں پر نت نئے مظالم پر بھی ہیں۔ خون کی ارزانی اس حد تک بڑھ چکی ہے۔ کہ اس سے عام آدمی کی سیاسی سوچ میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ انتخابات مسائل کا حل نہیں، پرچی کا فیصلہ رائیگاں ثابت ہوا ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ عوام نے ایوب خان کے خلاف جس تحریک کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، اس کی بنیاد شخصی نفرت پر مبنی نہ تھی۔ ایسا ہوتا تو بارہ کروڑ عوام خیبر سے چاٹگام تک سروں پر کفن باندھے اپنے خون کا نذرانہ یوں نہ پیش کرتے، عظیم عوامی ابھار عکاس تھا، موجودہ نظام کے خلاف۔ نوکر شاہی، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے متحدہ محاذ کے خلاف —— آواز تھا، ان مظلوم فاقہ کش انسانوں کی، جو زیادتیوں کا نشانہ بنے تھے۔ جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔ بے روزگاری اور افلاس کے ہاتھوں زندہ درگور تھے۔

آج کیا ہو رہا ہے۔؟

کیا موجودہ سامراجی نظام کی جڑیں مضبوط کرنے کی انتھک کوششوں نے عوام کی کمر توڑنے میں کوئی گنجائش چھوڑی ہے؟

عوام آج بھی اپنا تاریخی کردار ادا کرنے کو تیار ہیں۔ وہی اس ملک کے مالک ہیں۔ یہ

(باقی صفحہ ۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد: ـــ ۲ شمارہ: ـــ ۲۰

۳۰ ستمبر - ۷ اکتوبر ۱۹۷۱ء

نگران

شوکت صدیقی

محمود شام

مدیر

ارشاد راؤ

معاونین خصوصی

ابراہیم جلیس، افضل صدیقی عبدالحمید چھاپرا

مجلس ادارت

وہاب صدیقی - نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر

غلام نبی بزمی

عکاس :ـــ الطاف رانا

بدل اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :- ۶۰ فلس دوبئی قطر: ۷۵ درم

سعودی عرب :- ۱۵ قرش۔ انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت

ہفت روزہ الفتح ۸۷ ڈی، ترسری کمرشل ایریا

پی، ای - سی - ایچ - ایس کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر ارشاد راؤ

مطبع حق آفسٹ پریس، لیاقت آباد - کراچی

یہ آہ و بکا شفاخانے کے صدر دروازہ سے اُٹھ رہی ہے

سامع

سنو یہ آواز!

شفاخانے کے والی یہ آواز سنو! یہ آواز ایک اسّی سالہ ضعیف و نادار، بے بس و لاچار، بے یار و مددگار خاتون کی ہے، یہ نوحہ کناں ہیں، یہ مجسمۂ فریاد ہیں۔ یہ صرف آہ و بکا ہیں۔

حیدرآباد کے لیاقت ہسپتال کے منتظم، یہ آہ و بکا تیرے شفاخانے کے صدر دروازے سے اُٹھ رہی ہے۔ یہ تیرے کانوں تک پہنچ نہیں پاتی۔ لیکن اس کی بازگشت سے ڈرو۔ یہ گونج نہ بن جائے، یہ پکار نہ بن جائے۔ کیونکہ یہ ضعیفہ، قوم کی غیرت ہے، لاج ہے، یہ دور دراز کے گاؤں سے کٹھن راستہ طے کر کے تیرے دروازے تک اس امید پر پہنچی ہے کہ شاید تو اس کا درد مٹا سکے۔ اور اس کی گود میں پندرہ دن کی عمر کا بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے اور یہ ضعیفہ سنسان رات کے اندھیارے میں اسے کبھی گود میں اور کبھی زمین پر لٹا کر، وقت کی گرانباریوں کو سُبک سار بنانے کے جتن کر رہی ہے، یہ بچہ بھی بیمار ہے، فقط اس کی بیمار ماں تیرے شفاخانے میں جگہ پا سکی۔

یہ بچہ، یہ معصوم، یہ ننھی کلی، یہ ضعیفہ، یہ سنسان ویران رات، یہ منظر، بڑا ہی کربناک، بڑا ہی دلسوز، بڑا ہی جانگداز ہے، لیکن ان خاموشیوں میں ضعیفہ کے نالوں کی آواز، لرزاں، لرزاں ہے، روشنیوں کا شہر خاموش ہے کیونکہ ان دمکتے شہروں کی فراواں مخلوق کا مقدر شاید فقط مرنے کی حسرت ہے۔

دن کے اجالے میں یہ دونوں شہر کے باسیوں کی نگاہِ التفات کے طلب گار رہتے ہیں۔ شاید کوئی حیدرآباد کا صاحب ثروت باسی، ان کی مدد کو آئے، ان کا دکھ درد پوچھے، ان کے علاج کی سبیل ڈھونڈے اور کمسن معصوم تیرے شفاخانے میں ماں کی آغوش کے سپرد کر دے۔ اور ماں اور بیٹے کو شفا مل جائے۔ ضعیفہ کا بوجھ ہلکا ہو جائے، ضعیفہ کی مراد پوری ہو جائے، قوم کی عزت محفوظ ہو جائے شہر کے باسیوں کی لاج رہ جائے۔

سنو! جانشینانِ مسندِ خیر الامم، خیر البشر، سید الانام سنو! ضعیفوں کے ملجا، غریبوں کے ماوا کی نام لیوا ان

اس کی گود میں پندرہ دن کی عمر کا ایک بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے

کی سرزمین پر اس ضعیفہ کی آواز سنو!

سنو! علاج سے ترستے ہوئے بچے کے بلکنے کی دلدوز آواز کو سنو!

سنو! یہ ضعیفہ اور ایسی سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں ضعیفائیں، نادار مائیں، بے بس بچے۔۔۔ شفا اور علاج کو ترس رہے ہیں۔

ان کی کوئی تو چارہ گری کرے۔۔۔ ان کے زخم کوئی تو سیئے۔۔۔ ان کا کوئی تو مسیحا بنے۔

کیا یہ سچ ہے کہ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔۔۔ جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔

اس ضعیفہ کے دل سے نکلی ہوئی آواز۔۔۔ حیدرآباد کے اجتماعی ضمیر سے پوچھتی ہے۔

حیدرآباد جس کے عالی شان ہوٹلوں میں ہر روز عشرت کی نئی داستانیں جنم لیتی ہیں۔۔۔ جہاں بالاخانوں میں سکوں کی جھنکار پر مجبور انسانیت رقص کرتی ہے۔ سندھ کی سرزمین جہاں وڈیرے مظلوم ہاریوں کے خون اور پسینے سے اپنی راتیں رنگین بناتے ہیں۔ اس ضعیفہ، اس معصوم کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ قلم رک گئے ہیں، زبانیں گنگ ہو گئی ہیں۔ اور ضعیفہ اور اس کا بچہ بلک رہا ہے۔ سسک رہا ہے تڑپ رہا ہے۔

حیدرآباد سندھ کا دھڑکتا ہوا دل، سندھ کی سیاست کا گہوارا، میروں، فقیروں اور پیروں کی سرزمین بھٹائی اور شہباز قلندر کے وجدانی گیتوں کی گونج میں ڈوبی ہوئی دھرتی پر لیاقت ہسپتال کے پتھر دل منتظم۔ سُن اس ضعیفہ کی آواز سُن

شاید یہ آواز اُن امیدواروں تک نہیں پہنچی جنہوں نے اس ضعیفہ کا ووٹ حاصل کرتے وقت بہتر علاج کی بشارت دی تھی۔

سنو! اے حیدرآباد کے راہگیرو! رنگ برنگی اور نئی نویلی لمبی لمبی کاروں میں گزرتے وڈیرو! تم یہ نہ سوچو ع

یہ بزم چراغاں رہتی ہے اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا

یہ طاق ہمیشہ ویراں نہیں رہے گا۔ اور تمہاری بزم ہمیشہ چراغاں نہ رہے گی۔

کیونکہ ؎

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے

الفتح

بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی جڑیں پھیل رہی ہیں



عبدالصمد اچکزئی اور یحییٰ بختیار پیپلز پارٹی میں شامل ہو جائیں گے

محمود شام

کوئٹہ ائیرپورٹ سے رخصت ہوتے وقت پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ اگر دسمبر میں قومی اسمبلی کا اجلاس نہ بلایا گیا تو پھر اسمبلی کا اجلاس بلوچستان کی پہاڑیوں، ویرسوامتہ کی غاروں اور سندھ کے ریگستانوں میں بلایا جائے گا اس سے پہلے جناح روڈ پر حاجی فتح خان کے شوروم کی بالائی منزل میں کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم عوام کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے اور اگر دسمبر میں اسمبلی کا اجلاس نہ بلایا گیا تو جمہوریت کبھی نہیں آئے گی اور ہم مقابلہ کریں گے۔ کیونکہ ہمیں مقابلہ کرنے میں مزا آتا ہے اور وقت آیا تو میں پھر کسی ائیرکنڈیشنڈ جیل میں نہیں جاؤں گا۔ بلکہ آپ کے ساتھ سب سے پہلی گولی کھاؤں گا۔"

بھٹو صاحب کا یہ لہجہ بعض عافیت پسندوں کو ناگوار گذرتا ہے۔ یہ عافیت پسند خود پیپلز پارٹی میں بھی ہیں اور باہر بھی لیکن انہیں معلوم نہیں کہ وقت کس طرح تیزی سے گذر رہا ہے۔ پاکستان کے کیا حالات ہونے والے ہیں بلوچستان، سندھ، پنجاب اور سرحد کے عوام کی اکثریت اس وقت جن حالات میں زندگی بسر کر رہی ہے وہ ان عافیت پسندوں کی نگاہ سے اوجھل ہے یا وہ جان بوجھ کر آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں ورنہ صورت حال یہ ہے کہ عام انسان کی روزمرہ کی ضروریات انتہائی مہنگی ہو گئی ہیں جینا دوبھر ہو گیا ہے بیوروکریسی کے ہاں کوئی شنوائی نہیں ہے۔ مارشل لا والے بھی بیوروکریسی کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے منتخب نمائندوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ الیکشن ہوئے ایک برس ہو گیا۔ حالات میں بے یقینی بڑھ رہی ہے۔

مسٹر بھٹو نے اپنی پارٹی کے کارکنوں، اپنے ووٹرس کے دباؤ اور اپنی عمر کے تقاضوں کے باوجود اب تک اگر پرامن اور مصالحانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ تو حالات کی نزاکت کے باعث۔ ان پر پارٹی کے جذباتی اور انقلابی عناصر کی طرف سے دباؤ بھی پڑ رہا ہے پھر ایسے تکلیف دہ حالات بھی سامنے ہیں کہ کراچی کے صنعتی علاقے میں ہزاروں مزدور بے روزگار ہو گئے ہیں۔ کسان پھر خون کئے جا رہے ہیں۔ کوئی محاسبہ نہیں ہو رہا ہے۔

میں نے اس مرتبہ بھی بھٹو صاحب اور ان کی پارٹی کے ممتاز رہنماؤں، سنٹرل کمیٹی کے ارکان کے ساتھ کوئٹے کا سفر کیا۔ بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی اگرچہ کوئی باقاعدہ تنظیم تو نہیں ہے پھر بھی پیپلز پارٹی کا کارکنوں کی حد تک بڑا گہرا اثر ہے۔ کوئٹہ ائیرپورٹ پر بڑا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ سنٹرل کمیٹی کے رکن طاہر محمد خان اور اور منتخب رکن صوبائی اسمبلی نوابزادہ یوسف علی مگسی اور دوسرے ممتاز اراکین موجود تھے۔ لوگوں کی بھاری تعداد تھی۔ سنٹرل کمیٹی کے دو روزہ اجلاس، پارٹی کے لیڈروں سے ملاقات، خان، عبدالصمد خان اچکزئی منتخب رکن بلوچستان اسمبلی کے سنٹرل کمیٹی سے خطاب، سردار اکبر بگٹی خان آف قلات سے غیررسمی ملاقاتوں کے بعد مسٹر بھٹو نے کارکنوں سے خطاب میں جو لہجہ اختیار کیا، وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ان تمام ملاقاتوں کے بعد انہیں اپنے اس موقف کی اور تائید حاصل ہو گئی ہے کہ اگر دسمبر میں قومی اسمبلی کا اجلاس نہ بلایا گیا اور نیا سال نئے جمہوری دور کے ساتھ شروع نہ ہوا۔ تو جمہوریت کے امکانات بالکل دھندلا جائیں گے۔ اسی بات پر انہوں نے اس اجلاس میں زور دیا۔ ان کی اس تقریر کے چند اہم نکات میں یہاں دہرا رہا ہوں مفصل تقریر اپنی کوئٹہ رپورٹ میں آئندہ شماروں میں بیان کی جائے گی۔

- قائداعظم اور قائد ملت کے بعد آنے والے حکمرانوں نے عوام کو بالکل نظرانداز کر دیا صرف محلاتی سازشیں کرتے رہے۔
- اپنی لالچ میں محدود رہے۔ ملک کو قرضوں میں ڈبو دیا۔
- بلوچستان کے وسائل کو بلوچستان کے مسائل حل کرنے پر صرف نہیں کیا گیا۔ اگر اور وسائل بھی مل گئے تو یہ سور کے بچے ان کو بھی "ہپ" کر کے ہضم کر جائیں گے۔
- اگر پیپلز پارٹی ناکام رہی تو بھی ان شکست خوردہ عناصر کی حکومت نہیں آسکتی۔ تاریخ کو کبھی پیچھے نہیں لے جایا جا سکتا۔ عوام ان سرمایہ داروں رجعت پسندوں کو دوبارہ منتخب نہیں ہونے دیں گے
- اگر پیپلز پارٹی کی حکومت نہ بنی تو یہی فوجی حکومت چلے گی مارشل لاء زون اے۔ بی سی۔ ڈی۔ وغیرہ وغیرہ۔
- میں عوام سے کبھی غداری نہ کروں گا۔ اس دن کی نسبت مرجانا پسند کروں گا۔
- ماؤزے تنگ جیسی عظیم اور عالمگیر شخصیت بھی اقتدار سے پہلے اپنے منشور اور پروگرام پر عملدرآمد نہیں کر سکی میں کونسی چیز ہوں کہ منشور کو اقتدار سے پہلے عمل میں لے آؤں۔ ہمیں خیرات کے اڈے تو قائم نہیں کرنے ہیں۔
- ہم شروع سے اور کھلے عام سچی بات کہتے آرہے ہیں اگر اور کسی میں جرات ہے۔ تو آؤ کان میں کہتے ہیں "بڑے تنگ آگئے ہیں، فوجی حکومت سے نہ جانے کب جائے گی"۔
- ہم نے مارچ سے ستمبر تک صرف مذاکرات کئے

اگر نیا سال جمہوریت کے دور کے ساتھ شروع نہ ہوا تو ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑیگا

اب اس نوبت کو پہنچ گئے ہیں کہ خزانہ میں کچھ نہیں ہے۔ بین الاقوامی وقار ختم ہوگیا۔

- وزارت اطلاعات کیا کرے گی۔ جس کے سیکرٹری کو انگلش کی چار لائن بھی لکھنا نہیں آتیں۔

ہماری جد وجہد جاری ہے اسمبلی کے اندر بھی اسمبلی کے باہر بھی۔ اندر اگر ۳۰۰ بیٹھے ہوں گے تو باہر تو بارہ کروڑ ہوں گے۔

- لاہور میں یعقوب مسیح جو میرا ورکر تھا۔ میرا دوست تھا، اسے "کالا" کہتے تھے وہ کالا نہیں تھا کالا تو وہ ہے جو دستور لکھ رہا ہے۔ ہم نے کالا نہیں دی مگر دیکھو لاہور میں کیا ہوگیا ہے ہمیں آزمائش میں نہ ڈالو۔ پیپلز پارٹی کی تو وہ طاقت ہے جس سے بھارت بھی ڈرتا ہے۔
- میرا تاثر یہ ہے کہ صدر یحیٰی چاہتے ہیں کہ جمہوریت دیں گے۔ اگر نیا سال جمہوریت کے دور کے ساتھ شروع نہ ہوا تو ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا
- بھٹو ائیر کنڈیشنڈ جیل میں نہیں جائے گا، باہر رہے گا۔ پہلی گولی کھاؤں گی، کیونکہ ہم جائز جد و جہد کر رہے ہیں۔ ہم پاکستان کو تقسیم کرنے اور علیحدگی کے لئے نہیں لڑ رہے۔ ہمیں مجبور کیا گیا تو خالی ہاتھ لڑیں گے، سچ صداقت اور حق ہمارے ساتھ ہوگا۔

- اگر اگلا بجٹ عوامی حکومت نے نہ بنایا تو جمہوریت ختم۔ پھر یا غلاموں کی طرح لیٹ جانا ہوگا۔ یا پھر اس زندگی سے موت بہتر ہوگی۔
- مزدوروں کسانوں نوجوانوں تمہیں زنجیریں توڑنی ہیں، آپ کی تکلیفیں دور نہ ہوئیں تو

مزدورو، کسانوں، نوجوانوں

تمھیں زنجیریں توڑنی ہیں،

آپ کی تکلیفیں دُور نہ ہوتیں

تو کم از کم آپ کی آئندہ نسلوں

کی تکلیفیں تو دُور ہوں گی

کم از کم آپ کی نسلوں کی تکلیفیں تو دور ہو جائیگی یہ اس تقریر کے اہم نکالات تھے، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اندر سے بھٹو مطمئن ہے یہ سب باہر کی باتیں ہیں، عوام کے لئے اور اپنی پارٹی کے انتہا پسندوں کے لئے یہ بھی ایک خیال خام ہے ورنہ پیپلز پارٹی جیسی پارٹی جو پارلیمنٹ کے اندر اور باہر بھی جد وجہد کی قائل ہے اسے دونوں طرف تیار رہنا چاہیئے

مسٹر بھٹو نے اب کے دونوں محاذوں کی تیاری کی ہے۔ کارکنوں کو عوام میں پھیل جانے کی ہدایت کی اور پارلیمانی محاذ پر۔ مختلف اراکین اسمبلی سے بات چیت کی۔ یوسف علی مگسی تو پیپلز پارٹی کے لئے واپس آگئے۔ غوث بخش تیسانی ایم۔ پی۔ اے نے بھی مکمل حمایت کا اعلان کر دیا۔ خان عبد الصمد اچکزئی نے پیپلز پارٹی کے منشور میں کسی چیز کو بھی قابل اعتراض قرار نہیں دیا ان کا انٹرویو بھی آئندہ کسی شمارے میں دیا جائے گا۔ یحیٰی بختیار۔ کوئٹہ کی اہم سیاسی شخصیت ہیں اور کونسل مسلم لیگ کے ممتاز رہنما تاثر دیتے ہیں کہ وہ بھی پیپلز پارٹی کا اہم اثاثہ بن جائیں گے۔ خان آف قلات مسٹر بھٹو کو دیانتدار اور محب وطن سیاست دان قرار دیتے ہیں کوئٹہ میں مقیم غیر مقامی آبادی بھی پیپلز پارٹی سے ہم خیال ہے اس لئے سیف اللہ پراچہ بھی پر تول رہے ہیں۔ بلوچستان میں ابھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے بلوچستان کی مقامی تنظیم کے لئے بڑی دقتیں ہیں۔ بلوچستان میں ابھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے دشوار گزار مقامات اور سرداروں کے علاقوں میں مختلف پابندیاں۔ یہ تنظیم کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں لیکن آہستہ آہستہ راستہ ضرور ہموار ہو جائے گا۔"

اب صرف دسمبر تک کا وقفہ ہے۔ یعنی اکتوبر نومبر اور دسمبر۔

اس کے بعد یہ بھی ہے کہ اگر پیپلز پارٹی نے بھی وقت بڑھایا تو اس کا دور بھی ختم ہو جائے گا۔ کافی صبر ہو چکا۔ کافی انتظار ہو چکا۔

بقیہ :- اداریہ

ملک کسی کے باپ کی جاگیر نہیں.

اچھا ہوگا کہ یہ پرچی کا فیصلہ جلد مان لیا جائے اس میں اس نظام کے محافظوں کی بھلائی کے بہت سے راز مضمر ہیں، یہی ان کے لئے بہتر راستہ ہے۔ کم ازکم عوام پھر اپنے نمائندوں سے بات کرنے کے اہل تو ہو جائیں گے اور ملک اندرونی خلفشار سے بچ جائے گا.

آئندہ شمارے میں

- بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے دو روزہ اجلاس، مسٹر بھٹو کی مصروفیات، خان عبد الصمد اچکزئی اور خان آف قلات سے ملاقاتیں، پیپلز پارٹی کے مقامی لیڈروں اور کارکنوں سے ملاقاتیں۔ کوئٹہ قلات کے حالات ——— محمود شام کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں



- ——— پنجاب یونیورسٹی میں کیا ہو چکا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟
- ——— پاکستان تمباکو کمپنی کی ملک دشمن سرگرمیوں کا پردہ چاک

اس کے علاوہ دیگر مستقل عنوانات

اتنی مہنگی دوائیں ۔۔ اس سے تو موت سستی ہے



دوائیوں کے تاجر

انسانی لہو سے ہوس زر کی

پیاس بجھا رہے ہیں

نعیم آروی

امجد علی کی بیوی بیمار تھی ڈاکٹر نے بتایا" بیماری کی طوالت سے تمہاری بیوی لاغر ہوگئی۔ خون کی کمی ہے پہلے یہ دو دوائی کھلاؤ۔ ذرا جسم میں جان آجائے پھر اصل مرض بھگانے میں آسانی رہے گی۔" ڈاکٹر صاحب نے نسخہ میں نیوبلکس سو پر ایک ہزار ملی گرام اور HAE MOGLOBIN لکھ کر دیا۔ امجد علی معمولی کلرک ہے۔ اس نے گھبرا کر پوچھا" ڈاکٹر صاحب کہیں سو دو سو کا چکر تو نہیں پڑ جائے گا۔" ڈاکٹر اس کی پریشانی بھانپ گیا اس نے مسکراتے ہوئے کہا" نہیں بھئی۔ نیوبلکس ۱۳ روپے ۹۰ پیسے میں مل جائے گی۔ HAEMOGLOBIN کی قیمت بھی ۱۳ روپے ۹۰ پیسے ہے۔ ۲۷ روپے ۸۰ پیسے میں کام بن جائے گا۔"

امجد علی کے پاس پہلے سے کچھ پیسے تھے۔ کچھ اپنے دوستوں سے لے کر کیمسٹ کی ایک دکان پہ گیا۔ دکاندار نے دونوں دوائیوں کا پاکٹ بنا کر اسے دیا۔ اور ان کی قیمت ۳۳ روپے طلب کی۔ امجد علی خاصہ پریشان ہوا اس نے دکاندار سے کہا" بھائی مجھے تو ان دونوں کی قیمت ۲۷ روپے ۸۰ پیسے بتائی گئی تھی۔ تم مجھ سے ۳۳ روپے وصول کرتے ہو۔ آخر یہ کیا اندھیر گردی ہے۔"

کیمسٹ نے پہلے تو پیکٹ رکھوالیا۔ پھر ناک کی پھنگی پر پھسلتے ہوئے چشمے کی کمانی ٹھیک کرتے ہوئے کہا" دوا خریدنی ہو تو پورے پیسے دکھ کر چلا کرو۔ پہلے ان کی قیمت بالترتیب ۱۳ روپے ۹۰ پیسے تھی۔ اب ان کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ بازار میں جہاں جاؤ گے نیوبلکس ۱۷ روپے اور ہیموگلوبین ۱۶ روپے میں دستیاب ہوں گے۔ پہلے پورے پیسے لے آؤ پھر دوا لے جانا۔"

دکاندار کی باتیں سن کر امجد علی کا منہ کھل گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔" یا اللہ صرف چند روز کے اندر اندر دوا پر اتنی قیمت چڑھ گئی۔ یہ پہلے ہی ہم جیسے پھٹے حال لوگوں کے اختیار سے باہر تھیں اب تو ہم ان کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتے۔ اس سے تو موت اچھی اور سستی ہے۔" امجد علی کے پاس پورے پیسے نہیں تھے۔ لہذا اُسے مجبوراً خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔ چارپائی پر پڑی ہوئی اس کی بیوی ان کہی کہانی سمجھ گئی۔ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس کے کان میں بالیاں پڑی تھیں۔ بے کار، فضول۔ میل اور پسینے میں سیاہ ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے انہیں اتار کر شوہر کو دیدیا۔ امجد علی انہیں اونے پونے فروخت کر کے ڈاکٹر کے بتائے ہوئے نسخے کے مطابق دوا لے آیا۔ آئندہ وہ کس طرح سے اپنی بیوی کا علاج کرے گا۔ اتنی مہنگی ادویات کہاں سے اور کیسے خریدے گا؟ اس کے بارے میں ہمیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس ملک میں بے شمار افراد دوا کی آس میں راہی ملک عدم ہو جاتے ہیں۔ دوا دارو اور علاج معالجے کے بغیر ہمارے یہاں مرنے کی روایت خاصی پرانی ہو چکی ہے۔

سال رواں کے بجٹ اور مشرقی پاکستان کی موجودہ صورت حال سے ملک کی ہر چیز متاثر نظر آتی ہے اگر کوئی متاثر نہیں ہوا تو وہ اس ملک کا سرمایہ دار اور تاجر طبقہ ہے۔ جس نے بجٹ اور مشرقی پاکستان کے حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنی مصنوعات کی قیمتوں میں زبردست اضافہ کر کے اپنا سارا خسارا پورا کر لیا۔ یہی حال ادویات کا بھی ہے۔ یہ پہلے ہی مہنگی بکتی تھیں۔ سائنس کی دوا LEDERCORT ۳۳ روپے ۴۱ پیسے۔ ٹی بی کی دوا — MYAMBUTOL-INA بلڈ پریشر کی دوا ALDACTONE-A ۳۰ روپے میں دستیاب ہوتی تھیں۔ جگر کی بیماری کی دوا — HEPAREGEN دس روپے ۵۰ پیسے میں ملتی تھی اب اس کی قیمت ۱۴ روپے ۵۰ پیسے ہوگئی۔ کبریم

الفتح

ہر سال سینکڑوں مایوس مریض دوا کے بغیر دم توڑ دیتے ہیں



۶ روپے ۵۰ پیسے کی آتی تھی اب اسکی قیمت سات روپے ہو گئی۔ FERRADOL ۶ روپے ۳۸ پیسے سے بڑھ کر، ۷ روپے ۴۴ پیسے کی ہو گئی۔ اس طرح جوڑوں کے درد کی ایک دوا DORSILAN ۷ روپے ۳۷ پیسے میں ملتی تھی۔ اب بازار میں اس کی قیمت ۱۰ روپے ہو گئی۔ آنکھوں میں ڈالنے کی دوا ــ CORLIMYCIN ۵ روپے ۵۰ پیسے سے بڑھ کر، ۷ روپے میں ملنے لگی۔ اسپرو کی ۳۰ گولیوں کا پاکٹ ۹۰ پیسے میں مل جاتا تھا۔ اب ایک پاکٹ کے لئے ایک روپیہ ۴۰ پیسے دینے پڑتے ہیں۔ بخار، کھانسی نزلہ اور زکام جیسے عام امراض میں دی جانے والی دوا کی قیمتیں بڑھا دی گئیں۔ غریب عوام پریشان ہیں۔ دوائیں پہلے ہی مہنگی تھیں۔ گرانقدر، عام آدمی کی قوت خرید سے کہیں زیادہ۔ اخبارات کے کالم گواہ ہیں۔ ہر سال کئی افراد دوا کے حصول میں ناکام ہونے کے بعد خودکشی کر لیتے ہیں۔ یا کسی فٹ پاتھ کے گوشے میں دم توڑ دیتے ہیں۔ سال رواں کے بجٹ کے اعلان کے بعد تو ان کا حصول ناممکن ہو گیا۔ ادویات پر نئے سرے سے بڑھائی گئی قیمتیں پاکستان کے عوام، اور مفلوک الحال شہریوں کی زندگی میں بے شمار المناک واقعات کو جنم دیں گی۔

ادویات کی قیمتوں میں اس گرانقدر اضافہ کا سبب معلوم کرنے کے لئے میں عام لوگوں کے علاوہ متعلقہ افراد سے بھی ملا۔ مجھے بتایا گیا ادویہ ساز کمپنیوں نے نئی پالیسی کے اعلان سے قبل ضروری ادویات کی قیمتوں میں ۵ فی صد اور عام ادویات پر ۱۵ فیصد کا اضافہ کر دیا۔ اس اضافہ کا جواز یہ بتایا گیا کہ پہلے بیرونی ملکوں سے ادویات نقد لائسنس پر منگائی جاتی تھیں جس پر درآمد کنندگان کو زبردست منافع ملتا تھا مثلاً ۱۰۰ روپے کی ایک دوا کے دیگر اخراجات پر انہیں ۲۰ روپے ادا کرنے پڑتے تھے۔ اس طرح باہر سے آئی ہوئی ایک سو روپے کی ایک دوا پاکستان میں ۱۲۰ روپے کی پڑتی۔ درآمد کنندگان کو اس پر ۷۰ فی صد منافع ملتا تھا۔ اور اسی ۱۲۰ روپے کی دوا کی "بازاری قیمت" ۲۰۰ روپے مقرر کی جاتی۔ مشرقی پاکستان کی صورت حال کی وجہ سے حکومت نے نقد لائسنس پر ادویات درآمد کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا، اور ۲۴ اپریل ۱۹۷۱ء سے کیش کم بونس کا طریقہ کار جاری کر دیا۔ چونکہ اس نئے طریقہ سے درآمد کنندگان کا بھاری منافع متاثر ہوتا تھا اس لئے درآمد کنندگان کے نمائندوں نے ۳۰ اور ۳۱ جولائی کو اسلام آباد میں حکومت کے متعلقہ حکام سے ملاقات کی اور انہیں نئی صورتحال سے آگاہ کیا۔ حکومت نے نئی پالیسی کے اعلان سے قبل زندگی بچانے والی ادویات پر ۵ فیصد اور عام ادویات پر ۱۵ فی صد کے عارضی اضافے کی منظوری دے دی۔ واضح رہے کہ بونس واؤچر کے تحت باہر سے منگائی جانے والی ۱۰۰ روپے کی ایک دوا کی کسٹم ڈیوٹی، انشورنس، کلیرنگ، فارورڈنگ، چنگی، لائسنس فیس اور بنک منافع نکالنے کے بعد بھی ۵۰ فی صد منافع ملتا ہے۔ سنا گیا ہے کہ ادویات کی نئی قیمتوں کے تعین کے سلسلے میں جاری ہونے والی نئی پالیسی میں درآمد کنندگان کے بھاری منافع کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اگر ایسا ہے، اور ادویات پر بڑھائی گئی قیمتیں کم نہ ہوئیں تو ضروری اور عام دوائیں غریب آدمی کی دسترس سے باہر ہوں گی پہلے وہ کسی نہ کسی طرح چند دوائیں حاصل کر لیتے تھے مگر اب شاید دوا کے تصور میں ان کے خیال و خواب کے پر جل جائیں۔

اس سلسلے میں جب میں نے عوامی حلقوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے ملاقات کی تو انہوں نے بتایا "ہمارے یہاں کاروباری حلقہ اپنے کاروبار کے ذریعہ غیر معمولی منافع حاصل کرنے کا عادی بن چکا ہے۔ اسے اپنے منافع سے مطلب ہوتا ہے۔ وہ نہیں دیکھتا کہ بعض اشیاء کی قیمتوں میں معمولی اضافہ سے عوام کی قوت خرید کس قدر متاثر ہوگی۔ ادویہ ساز کمپنیاں اور ان کے درآمد کنندگان بااثر حلقہ ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ نئی پالیسی کے اعلان سے قبل ہی ادویات پر ۵ فیصد سے لے کر ۱۵ فی صد تک قیمتیں بڑھا دی گئیں۔ اس طرح نوکرشاہی، جو سرکاری مشینری میں ایک اہم پرزے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمیشہ ان پالیسیوں کو ناکام بنانے میں پیش پیش رہتی ہے۔ جس کا مقصد عوام کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔ حکومت ادویات کی قیمتوں میں اضافہ کے خلاف تھی اور اسی وجہ سے حکومت اور درآمد کنندگان کے نمائندوں

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں

ایک اسلام پسند پیر ـ لائسنس ـــ اور لادینی ملک

منیجر کی تیاری کے دوران اس بات کا بھی انکشاف ہوا کہ ایوب خاں نے اپنے دور اقتدار میں سندھ اور پنجاب کے بعض جاگیرداروں، وڈیروں اور پیروں کو خوش رکھنے کے لئے انہیں ادویات درآمد کرنے کے لائسنس جاری کروا دیئے تھے۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ چین جیسے اشتراکی ملک سے ادویات منگانے کا لائسنس ایک ایسے "پیر" کو دے دیا گیا جو ایوبی دور میں بار بار اسلامی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور سوشلسٹوں کو قابل گردن زدنی سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہی صاحب ایک غیر اسلامی اور "غیر صالح ملک" سے دوائیں درآمد کر کے اچھی خاصی دولت سمیٹ چکے ہیں یہی نہیں بلکہ وہ نیک و بد اور صالح و غیر صالح کی تمیز سکھانے والے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ـــ "کافر اور کمیونسٹ ملکوں سے لین دین حرام ہے ـــ

جی ہاں! ـــ مگر اسلام کے اس حکم کا اطلاق ان کے نجی کاروبار پر نہیں ہوتا ہے؟

آج ضمیر فروشوں کی بہتات ہے اور ضمیر صدّیقی کم ہیں

ھر انقلاب شروع شروع میں بہت مستحسن نظر آتا ہے۔ عوام میں پسند کیا جاتا ہے اس لئے کہ انقلابی اپنے قدم جمانے کے لئے کچھ سماج سدھار کی باتیں بھی کرجاتے ہیں۔ عوام کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے ایوب خاں قائدِ انقلاب نے بھی زرعی اصلاحات نافذ کیں۔ عوام کو اقتدار میں شریک کرنے کی آڑ میں بدعنوانیوں کو فروغ دینے اور قوم کے اسی ہزار افراد کو اپنی مرضی کے تابع بنانے کے لئے بنیادی جمہوریتوں کا نظام رائج کیا۔ زرعی اصلاحات بظاہر توڑی انقلابی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر دراصل ان سے بڑے بڑے زمینداروں کی سرپرستی ہوتی تھی۔ متوسط زمینداروں کو ہر طرح کا تحفظ حاصل ہوگیا تھا۔ ہل چلانے والے اور کھیت جوتنے والے انسان کا ان اصلاحات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی حالت پتلی کی پتلی ہی رہی بلکہ اس کے خون پر پلنے والوں کے تشکم اور زیادہ بڑے ہوگئے زراعت اور سیاسی نظام ہی میں اصلاحات نہیں کی گئیں بلکہ اصلاحات کے پردے میں رہی سہی شہری آزادیوں اور انسانی حقوق کو پامال کرنے کے لئے صحافت تعلیم اور نظام قانون میں بھی "انقلاب" کا چکر شروع ہوگیا ہر جگہ اصلاحات، ہر شعبہ میں اصلاحات۔ ایسا لگتا تھا کہ پاکستان کا چہرہ بالکل ہی بدل جائے گا۔ اور واقعی یہ چہرہ اتنا بدل گیا کہ دس سال کے اندر سارے حقیقی خد وخال مٹنے لگے۔ اور مٹ جاتے اگر دس سالہ جشن ترقی و اصلاحات نہ منایا جاتا۔ استبداد کا یہ دس سالہ دور پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ سارا کیا دھرا کسی ایک شخص کا نہیں تھا۔ اس تباہی کے عمل میں بہت سے لوگ شامل تھے۔ اندرونی طاقتیں بھی کام کر رہی تھیں اور بیرونی طاقتیں بھی۔ میں صرف فیلڈ مارشل ایوب خاں کو اس کا ذمہ دار قرار نہیں دے سکتا۔ کیونکہ ابتدا میں اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس نے جن سیاستدانوں کی زبان بندی کی ہے۔ وہ ایک روز اسے اپنے چنگل میں جکڑ لیں گے۔ یہ وہی سیاستدان اور ان کے مہرے تھے۔ جو آج شکست کی کالک منہ پر لگائے فاتحانہ انداز سے مسکرا رہے تھے۔

اس دور میں کچھ اچھی باتیں بھی ہوئیں۔ اور اس وقت تک ہوتی رہیں جب تک جنرل اعظم، جنرل برکی، جنرل شیخ جیسے "مشیروڈ" لوگ اقتدار کی باگیں تھامے رہے۔ اور ان پر تمن۔ بچہ۔ دلّو قسم کے لوگوں کا سایہ نہیں پڑا۔ اور انہیں مقبول عام نبتا دیکھ کر چلتا نہیں کر دیا گیا۔ جنرل برکی بھی معقولیت پسند آدمی تھے۔ محنت وسماجی بہبود کے ذمہ دار وہی بنائے گئے تھے۔ وفاقی انجمن صحافیاں پاکستان (پی ایف یو جے) ملک بھر کے محنت کش صحافیوں کی حیثیت بہتر بنانے اور ان کے جائز حقوق منوانے کے لئے عرصہ دراز سے جو جد وجہد کر رہی تھی وہ جنرل برکی کے عہد ہی میں بار آور ہوئی۔ عامل صحافیوں کے لئے اجرتوں کا آرڈی ننس نافذ کیا گیا اور صحافیوں کی تنخواہوں کے باقاعدہ اسکیل مقرر اور حالات کار بہتر بنانے کے لئے اجرت بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے ملک بھر کا دورہ کر کے صحافیوں، مالکان اخبارات اور اخباری صنعت کے دیگر متعلقہ افراد سے ملاقاتیں کر کے اور ان کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد سفارشات مرتب کیں۔ اور انہیں آرڈی ننس کی صورت میں نافذ کر دیا گیا۔ اس آرڈی ننس کے نافذ ہوتے ہی امروز کے سوا ہر اخبار میں کھلبلی مچ گئی۔ سرمایہ دار مالکان اخبارات نے بڑی ہاہا کار مچائی۔ حکومت کو یعنی جنرل برکی کو خدا کے بڑے واسطے دیئے اپنے افلاس اور تنگدستی کا بہت رونا رویا۔ مگر اس زمانے میں ڈنڈا چل رہا تھا۔ اس لئے ان کی ایک نہ چلی۔

مگر پھر تھوڑے عرصے کے بعد صرف ان ہی کی چلتی رہی۔ قصّہ یہ ہے کہ یہ دستور بہت پرانا چلا آتا ہے کہ اپنے ملک میں قانون تو آسانی سے بنائے جاتے ہیں۔ مگر ان پر عملدر آمد کرانے کے لئے کوئی مشنری نہیں ہوتی۔ جس طرح امن عامہ کے تحفظ کے قوانین پر عمل کرانے کے لئے پولیس ہے، خفیہ محکمے ہیں، عامل صحافیوں کے لئے بڑے شہروں کے اے کیٹگری کے اخبارات میں جو کم سے کم تنخواہ اجرت بورڈ نے مقرر کی تھی وہ ۱۷۵ روپے بنیادی تھی مہنگائی بھتہ وغیرہ ملا کر کسی اخبار میں کام شروع کرنے والے صحافی کو ابتدائی مجموعی تنخواہ ۳۲۳ روپے طے پائی تھی اور یہ بھی طے پایا تھا کہ قانون کے مطابق پانچ سال کی مدّت ختم ہونے پر یہ اجرت بورڈ بھی ختم ہوجائے گا۔ اور خود بخود نیا اجرت بورڈ بنے گا۔ جو بدلے ہوئے حالات کے مطابق صحافیوں کی تنخواہوں کا پھر سے جائزہ لے گا۔ اور نئے اسکیل مقرر کرے گا۔ مگر ۱۹۶۵ء میں جنگ چھڑی ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا گیا۔ قانون کی رو سے اجرت بورڈ نیا بننا تھا مگر نہ بنا۔ ۱۹۶۶ء میں بن جاتا، تب بھی نہ بنا۔ عامل صحافی شور مچاتے رہے۔ درپردہ سرمائے کے بل بتے قانون کے نفاذ کو ٹالنے کی سازشیں اور مرکزی وصوبائی وزارت محنت واطلاعات سے گٹھ جوڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ دس سال اس انتظار میں گزر گئے کہ اب نیا اجرت بورڈ بنے گا۔ اور اب محنت کش صحافیوں کے آنسو پچھیں گے دس سال کے اندر مہنگائی اتنی بڑھ گئی تھی اور اشیائے صرف اتنی گراں ہوگئی تھیں (مگر آج سے کم) کہ صحافیوں کو عزت اور سفید پوشی کا بھرم رکھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ بھاگ دوڑ دونوں طرف سے جاری تھی۔ مالکان اخبارات کی طرف سے بھی اور انجمن صحافیاں پاکستان کی جانب سے بھی آخر خدا خدا کر کے جسٹس عبدالسلام کی سربراہی میں نئے ویج بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی اس بورڈ کی نشستوں کا آغاز ہوا تو پھر وہی پرانے ہتھکنڈے اور لیت ولعل شروع ہوگئی۔ ان اجلاسوں میں مالکان اخبارات کے نمائندوں نے انصاف کی کوئی بات مان کر نہیں دی۔ اور سارا معاملہ عنت ولود کئے رکھا۔ یہ بڑی دھاندلی تھی۔ آخر جسٹس عبدالسلام کو اپنا فیصلہ صادر کرنا پڑا۔ انہوں نے نئے اسکیل کا تو اعلان نہیں کیا بلکہ صحافیوں کے لئے عبوری امداد کی سفارش کر دی۔ اس سفارش کو قانون کی شکل دے کر آرڈیننس کے طور پہ نافذ کر دیا گیا آرڈیننس کو نافذ ہوئے بھی مہینوں گزر گئے ہیں اور اس پر عملدرآمد نہیں ہو سکا۔ اس صورت حال سے اپنے ہی صحافیوں میں بے چینی پیدا ہونا فطری بات جن میں ان

الفتح کراچی

صحافیوں نے قربانیاں دے کر غیر صحافی برادری کے حقوق منوالئے

نے فیصلہ کر لیا کہ قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے حکومت کا قانون منصفانہ طور پر نافذ کرنے کے لئے بھرپور جدوجہد کی جائے۔ چنانچہ قانون کے مطابق مالکان اخبارات کو ہڑتال کا نوٹس دے کر اور صحافیوں سے ہڑتال کے حق میں تقریباً سو فیصد ووٹوں کے ذریعہ فیصلہ لے کر انجمن صحافیان پاکستان کی اپیل پر ملک بھر کے اخبارات میں ہڑتال کر دی گئی۔ جو دس روز جاری رہ کر کامیابی پر منتج ہوئی۔ ہڑتال سے پہلے تو مالکان کو صرف عامل صحافیوں کی اجرتوں میں اضافہ کرنا پڑتا یا عبوری امداد دینی پڑتی۔ ہڑتال کے بعد انہیں اپنے اخبار میں کام کرنے والے ہر ملازم کو عبوری امداد دینی پڑی۔ یہ بڑی فتح تھی لیکن اس فتح کی قیمت بہت سے صحافیوں کو اپنی بیروزگاری کی شکل میں ادا کرنی پڑی۔ اور ہر جدوجہد میں یہی ہوتا ہے۔ لاتعداد لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور چند افراد کو ایثار کرنا پڑتا ہے۔ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اس امید پر کہ ؎

بھلا سے ہم نہیں دیکھیں گے کوئی اور دیکھے گا

میں اور کئی ساتھی ابھی تک بیروزگاری کا عذاب جھیل رہے ہیں۔ میں نے تو اس جدوجہد میں کچھ بھی نہیں کیا۔ لیکن میرے جن ساتھیوں نے حق اور انصاف کے لئے جو قربانیاں دی ہیں اور دے رہے ہیں وہ خوش ہیں کہ ان کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔ بہت سے صحافی اور غیر صحافی کارکن ان کی اس جدوجہد کے اچھے نتائج سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ بعض لوگ مادی منفعت اور ذاتی مصلحتوں کی خاطر چاہے اس کا اعتراف نہ کریں۔ مگر مستقبل کے صحافیوں کے لئے یہ جدوجہد مشعل راہ بنی رہے گی۔ یہی ایک ایسی طمانیت ہے جس پر دنیا کا ہر انسان قربان کیا جا سکتا ہے۔

اس پر ہڑتال کے پس منظر اور ویج بورڈ کی تاریخ کا تذکرہ اس لئے ضروری تھا کہ اس کے بغیر دس بارہ سال پہلے کے اخبارات میں کام کرنے والے صحافیوں کے حالات کار کا اندازہ ہو جائے۔ جب پہلے ویج بورڈ کی سفارشات کا اعلان ہوا تو امروز کے سوا بیشتر اخبارات میں تنخواہوں کا کوئی اسکیل نہیں تھا۔ سب کچھ مالک کی صوابدید پر منحصر ہوتا تھا۔ اس کی مرضی آئے تو نااہل سے نااہل آدمی کو جی کھول کر نواز دے۔ اور جی نہ چاہے تو بڑے سے بڑا طرم خاں تعلیم یافتہ تجربہ کار صحافی اس کے چنگل میں پھنس کر خون تھوکنے لگے۔ میں نے چراغ حسن حسرت کو بھی کام کرتے دیکھا ہے اور ابو سعید بزمی کو بھی۔ دونوں اعلیٰ پائے کے بزرگ جرنلسٹ تھے۔ مگر دونوں میں فرق یہ تھا کہ حسرت صاحب کی میاں افتخار الدین قدر اور عزت کرتے تھے۔ اور بزمی صاحب نے میاں احسان الٰہی مالک روزنامہ "احسان" (لاہور۔ پشاور) کے ہاتھوں کبھی سکھ نہیں اٹھایا۔ لیکن یہ نہیں ہوا کہ ناقدری اور کم تنخواہ پر کام کرتے ہوئے کبھی انہوں نے اپنے فرض میں کوتاہی کی ہو۔ یہ لوگ اپنا ایک نصب العین رکھتے تھے۔ اور اس پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ یہ اصول پسندی اور حق کو حق کہنے کی عادت اب صحافیوں میں اس لئے کم ہوتی جا رہی ہے کہ وہ استحصال زدہ سرمایہ دارانہ معاشرہ کے اخباروں میں کام کرتے ہیں۔ اب اخبار مشن نہیں صنعت کا درجہ رکھتے ہیں اور جب مالک اخبار صنعت کار بن جائے تو پھر بے لاگ صحافت اپنا مشن کیسے پورا کر سکتی ہے۔

پہلے صحافیوں کو بھوکا رہ کر بھی کام کرنے کی عادت تھی۔ کیونکہ انہیں یقین ہوتا تھا کہ کل انہیں پیٹ بھر کر روٹی مل جائے گی۔ اب اس یقین کی دولت ان سے چھن گئی ہے اب تحفظ و سلامتی کا احساس ختم ہو گیا ہے پہلے پیسے کی ضرورت اتنی نہیں بڑھی تھی۔ دولت کمانے کا ہوکا نہیں تھا صحافی پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی کام کر لیتے تھے۔ مگر آج کے معاشرہ میں تو سرمایہ اور دولت بنیادی قدر ہے۔ آج صحافی کو یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ اگر اسے اخبار سے نکال دیا گیا تو ڈیڑھ سو روپے کی کلرکی بھی اسے نہیں مل سکے گی۔ اس لئے وہ ضمیر فروشی پر مجبور ہے۔ ہر شخص ضمیر صدیقی نہیں ہوتا۔ کم لوگوں میں اپنی دنیا آپ بنانے کا حوصلہ ہوتا ہے۔

یوں تو جب پہلے ویج بورڈ کا فیصلہ آیا تو امروز میں کام کرنے والوں کا کوئی خاص بھلا نہیں ہوا کیونکہ ان کی تنخواہیں پہلے ہی معقول تھیں۔ یہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے حکومت کے قبضہ میں جانے کے بعد کی بات ہے۔ امروز پاکستان ٹائمز وغیرہ ترقی پسندانہ رجحانات کے فروغ کے لئے کوشاں تھے۔ ۱۹۵۸ء کی انقلابی حکومت کی آنکھوں میں یہ اخبار بہت کھٹک رہے تھے۔ اس لئے پہلے ان اخباروں پر شبخون مارا گیا۔ یہ اخباروں کا گلا گھونٹنے اور ابلاغ عامہ کے ذرائع کو کنٹرول کرنے کے طویل سلسلے کا پہلا اقدام تھا فوج کے پہرہ میں محمد سرفراز سابق ڈائریکٹر نیوز ریڈیو پاکستان اور سابق سربراہ اطلاعات سیٹو نے میاں افتخار الدین کے اخباروں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ ان اخباروں میں کام کرنے والوں کے حالات کار تو متاثر نہیں ہوئے۔ لیکن ان اخباروں کی پالیسی بدل گئی اور وہ حکومت وقت کے سچے ترجمان سمجھے جانے لگے۔ جو لوگ اس انتظام سے اختلاف رکھتے تھے وہ کنارہ کر گئے۔ باقی نے وہیں رہ کر اپنے نصب العین کی پاسداری کی راہیں تلاش کر لیں۔ اس وقت نیشنل پریس ٹرسٹ قائم نہیں ہوا تھا۔ ویج بورڈ سے میری تنخواہ بڑھنے کا بھی سوال پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ میں پہلے تو سال بھر تک لیو ویکنسی پر کام کرتا رہا۔ مگر پھر اپنے ایک ساتھی نصیر حسین کے انتقال پر ان کی جگہ میرا مستقل تقرر ہو گیا۔ نصیر حسین پرانے صحافی تھے۔ قاضی عبدالغفار کے اخبار "پیام" (حیدرآباد دکن) میں ایک عرصے تک کام کر چکے تھے۔ امروز کراچی میں وہ دینداری کام کر رہے تھے بچوں کے صفحہ کے انچارج تھے اور بچوں میں "اتو بھیا" کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ میں ان کا نعم البدل تو ثابت نہیں ہو سکتا تھا لیکن قاضی ابرار صدیقی نے مجھ پر اعتماد کر کے جو ذمہ داریاں مجھے سونپی تھیں میں انہیں دیانتداری کے ساتھ نبھانے کا عہد کر چکا تھا۔ میری تنخواہ میں ویج بورڈ کے فیصلہ سے ایک سو روپے کا اضافہ ہو گیا۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اسٹار نیوز ایجنسی کی ملازمت چھوڑ دوں تاکہ روزنامہ امروز میں میں پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ کام کر سکوں۔ عثمان صدیقی سے ذکر کیا تو انہوں نے قاضی ابرار صاحب سے شکایت کر دی کہ یہ بھاگ رہا ہے قاضی صاحب نے معاملہ میری مرضی پر چھوڑ دیا۔ عثمان صدیقی نے یہ شرط عاید کی کہ میں اپنی جگہ اسٹار نیوز ایجنسی میں کام کرنے کے لئے کسی معقول آدمی کا بندوبست کر دوں تو میری جان چھوٹ سکتی ہے لیکن مجھے اپنے سوا کوئی ایسا آدمی نہیں ملا۔ چنانچہ میں وہاں بھی بدستور کام کرتا رہا اور امروز کی نائٹ شفٹ میں کام کرنے کے علاوہ ہر اتوار کو بچوں کا صفحہ بھی مرتب کرتا رہا۔ (باقی آئندہ)

پیپسی کولا کی ایجنسی کو معرکہ حق و باطل قرار دیدیا گیا

شوکت صدیقی

اومان کا مسئلہ عرب حکمرانوں کا خاصا پرانا جھگڑا ہے ۱۶ سال سے اُوپر ہو گئے مگر اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھتا۔ اس جھگڑے کے دو بنیادی فریق ہیں۔ ایک امام ہیں دُوسرے سلطان ہیں۔ بنائے فساد اقتدار کی رسہ کشی ہے۔ ہر فریق خود کو حق بجانب اور دوسرے کے دعوے کو باطل ٹھہراتا ہے اس طرح یہ معرکہ حق و باطل قرار پایا۔

حق و باطل کی اس جنگ میں زبردست خون خرابہ ہوا۔ تباہی و بربادی ہوئی۔ لیکن تنازعہ اپنی جگہ موجود ہے۔ یہ مسئلہ عرب حکومتوں کے درمیان موضوع بحث رہا۔ عرب لیگ کے اجلاسوں میں اس پر گرما گرم بحث ہوئی۔ اقوام متحدہ کے سامنے پیش ہوا۔ سفارتی سطح پر مذاکرات ہوئے یہ مذاکرات بھی ناکام ہوتے پچھلے دنوں فریقین کے درمیان بیروت میں براہ راست مذاکرات ہوئے۔ یہ مذاکرات بھی ناکام ہوتے مگر ان مذاکرات کی ناکامی سے اس مسئلہ کا ایک نیا نام پڑ گیا۔ اب اسے "پیپسی کولا کی جنگ" کہا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس کی تفصیل دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افروز بھی ہے۔

مسئلہ اومان کا ایک تیسرا فریق بھی ہے۔ وہ ہے ظفر محاذ آزادی یعنی اومان کے عوام جن کی نمائندگی نہ عرب لیگ کے اجلاسوں میں کسی نے کی نہ اقوام متحدہ میں ان کی آواز سنائی دی۔ البتہ جب عوام کی یہ انقلابی جدوجہد آگے بڑھی تو معرکۂ حق و باطل کے فریقین کو تشویش ہوئی۔ اور اس عوامی خطرے کے پیش نظر وہ براہ راست گفت و شنید پر آمادہ ہو گئے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سلطنت اومان اور مسقط میں عوامی مظاہرے ہو رہے ہیں۔ کئی بار کرفیو لگ چکا ہے۔ ایک خبر یہ بھی گرم ہے کہ اومان کی حکومت کا تختہ الٹ چکا ہے اور سلطان قابوس ہلاک کر دیئے گئے۔

اومان کے تنازعے کا آغاز اس وقت ہوا جب امام غالب نے اومان اور مسقط کے حکمران، سلطان سعید بن تیمور مرحوم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ امام غالب جبل اصغر کے مذہبی رہنما ہیں۔ یہ کوہستانی علاقہ ہے اور اومان کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ آبادی عرب قبائل پر مشتمل ہے۔ جو امام غالب کے پیرو ہیں۔ یہ علاقہ اومان سلطنت ہی کا ایک حصہ ہے۔ لیکن سلطان سعید کی عملداری امام غالب کو پسند نہ آئی، وہ چاہتے تھے کہ سلطان اس علاقے کے معاملات میں مداخلت نہ کریں اس طرح دونوں میں اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی۔

۱۹۵۵ء میں امام غالب نے اپنے معتقد قبائلی سرداروں کو اکٹھا کیا اور سلطان سعید کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا۔ انہوں نے سلطان پر الزام لگایا کہ وہ بدکردار اور عیاش ہے۔ رعایا پر ظلم و ستم ڈھاتا ہے۔ من مانی حکومت کرتا ہے۔ امام غالب نے اس بغاوت کو "جابر سلطان" کے خلاف جہاد قرار دیا۔ جبل اصغر کو اپنی آزاد اور خود مختار حکومت بنایا۔ نزوا پایۂ تخت قرار پایا۔ قبائل میں جب بغاوت کی آگ پھیلی اور شورش بپا ہوئی تو سلطان سعید نے ان کی سرکوبی کے لئے اپنی فوجیں جبل اصغر بھیجیں۔ مسلح جھڑپیں ہوئیں خونریز فساد ہوئے۔ کشت و خون ہوا۔ تباہی و بربادی ہوئی۔ مگر سلطان کو کامیابی نہ ہوئی۔

امام غالب پہاڑوں میں روپوش رہتے۔ ان کے حامی قبائل سلطان کی فوجوں پر شبخون مارتے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے اور اس کے بعد ان پہاڑی دروں میں غائب ہو جاتے۔ جہاں پہنچنا سلطان کی فوجوں کے لئے مشکل تھا۔ اس طرح سلطان کی پوزیشن روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ اور امام غالب کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس صورت حال سے پریشان ہو کر سلطان نے برطانیہ سے مدد مانگی جس کے ساتھ ان کا یہ دیرینہ معاہدہ تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ حکومت اومان کی فوجی مدد بھی کرے گا۔ یوں بھی برطانیہ کو یہ بات کسی طرح گوارہ نہ تھی کہ اومان میں کسی قسم کی شورش برپا ہو یہ ایک طرح سے اس کا ذیر نگیں علاقہ تھا۔ چنانچہ اس معاہدے کے تحت برطانوی فوجیں امام غالب کی سرکوبی کو روانہ کی گئیں۔ انگریزی فوجیں جدید اسلحہ سے لیس تھیں۔ امام کے قبائلی شتر سوار اپنی معمولی رائفلوں کے ساتھ اس فوج کے مقابلے میں زیادہ عرصے تک نہ ٹھہر سکے۔

امام کو پے بہ پے شکستیں ہوئیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ وہ اومان سے کسی نہ کسی طرح نکل کر سعودی عرب پہنچے۔ جہاں انہیں سیاسی پناہ مل گئی۔ امام نے اپنی جلاوطن حکومت قائم کی۔ اور سلطان کے خلاف اپنی سرگرمیاں از سر نو شروع کر دیں۔ امام کے حامی قبائل کی شورش جو عارضی طور پر دب گئی تھی اس نے دوبارہ سر اُبھارا۔

سعودی حکومت نے نہ صرف امام کی جلاوطن حکومت کو تسلیم کر لیا بلکہ اس کی مسلح کارروائیوں کے لئے مالی اور فوجی امداد بھی مہیا کرنی شروع کر دی۔ باعث اس کا یہ تھا کہ نخلستان بریمی پر سعودی حکومت کا سلطنت اومان کے ساتھ عرصہ دراز سے جھگڑا چل رہا تھا۔ شاہ سعود کا دعویٰ تھا کہ بریمی ان کا علاقہ ہے۔ امام کی امداد میں ایک اور قوت کا بھی ہاتھ تھا۔ جو در پردہ امام کی مدد کرتی تھی۔ یہ حکومت امریکہ تھی جس کا سعودی عرب پر پُورا اثر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ اپنے معاشی تسلط کے لئے مشرق وسطیٰ کے اکھاڑے میں اتر چکا تھا۔ اس کشمکش کی بنیاد تیل کے چشمے تھے۔ برطانیہ اس کا واحد رقیب تھا۔ جو اس وقت مشرق وسطیٰ کی معیشت اور سیاست پر حاوی تھا۔ اس علاقے میں تیل کی پیداوار پر اسی کی جو اجارہ داری تھی اس میں امریکی کمپنیاں بھی حصہ دار بنتی جا رہی تھیں۔ مسقط اور اومان کے تیل پر برطانوی کمپنیاں قابض تھیں۔ برطانیہ اس کو برقرار بھی رکھنا چاہتا تھا۔

برطانیہ اور امریکہ کی اس اقتصادی رقابت سے امام غالب کو فائدہ پہنچا۔ انہوں نے سلطان سعید کے خلاف اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں۔ برطانیہ کی مخالفت میں چند دوسری عرب حکومتوں نے بھی امام غالب کی جلاوطن حکومت کو تسلیم کر لیا۔ بعض عرب ملکوں میں ان

الفتح

اومان اور مسقط میں محاذِ آزادی کی سرگرمیوں سے فریقین خائف ہیں

کی شاخیں بھی قائم ہوگئیں۔ سعودی عرب اور مصر امام کا سب سے بڑا مددگار تھا۔ ۱۹۵۶ء میں برطانیہ نے اسرائیل اور فرانس کے ساتھ مصر پر حملہ کیا تو عربوں میں برطانیہ کے خلاف اور نفرت ابھری۔ امام غالب کی حمایت میں بھی اضافہ ہوا۔ عرب لیگ نے بھی امام کی جلاوطن حکومت کو تسلیم کرلیا۔ اور اسے لیگ کا رکن بنالیا۔

اس طرح مسئلہ اومان نے عربوں میں خاصی اہمیت اختیار کرلی۔ دوسرے ممالک کو بھی اس پر توجہ دینی پڑی آخر یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سامنے آیا۔ بحثیں ہوئیں۔ دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ عربوں نے برطانوی نوآبادکاروں کو ملزم ٹھہرایا۔ ان کی مذمت کی اور امام غالب کی حمایت کی۔ دوسری طرف برطانیہ اور اس کے حلیف تھے۔ جو سلطان کی حمایت میں اپنے دلائل پیش کرتے اور امام کو حکومت اومان کا باغی قرار دیتے۔ آخر کئی سال کی طویل بحثوں کے بعد اقوام متحدہ نے حقائق کی چھان بین کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی نے متنازعہ علاقہ کا دورہ کیا۔ سیکرٹری جنرل کو اپنی رپورٹ پیش کی۔ مگر مسئلہ کا کوئی حل نہ نکلا۔ مسئلہ اپنی جگہ برقرار رہا۔

اس دوران قبائل کی شورش، قبائلی سرداروں سے نکل کر اومان اور مسقط کے عرب عوام میں پھیلنے لگی۔ اس کی جڑیں گہری ہوتی گئیں۔ اس نے جلد ہی انقلابی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ جس کی قیادت ظفر محاذ آزادی کے ہاتھ میں تھی۔ یہ عرب کے صدیوں پرانے جاگیردارانہ نظام کے خلاف مظلوم عوام کا انقلابی عمل تھا۔ محاذ کے حریت پسندوں نے قبائلی سرداروں کی لوٹ مار اور انتشار پھیلانے والی حکمت عملی کی بجائے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ اور آج اومان کا خاصہ علاقہ ان کے قبضہ میں ہے۔ نہ وہ سلطان کے حامی ہیں نہ امام کے مددگار ہیں۔ وہ دونوں کو ایک ہی سکے کے دو رخ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک دونوں کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے عوام کا استحصال۔

حریت پسندوں کی جدوجہد سلطان سعید کے دور حکومت میں شروع ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سلطان قابوس حکمران ہوئے تب بھی انہوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اس انقلابی تحریک نے زور پکڑا تو امریکہ اور برطانیہ بھی چونکے۔ سعودی عرب اور عرب لیگ نے بھی کان کھڑے کئے۔ اب یہ کوششیں ہونے لگیں کہ امام اور سلطان کا معرکہ حق و باطل کسی نہ کسی طور طے کرا دیا جائے۔ عرب لیگ جو پہلے امام غالب کی حامی و مددگار تھی اب سلطان قابوس کو اومان اور مسقط کا قانونی حکمران تسلیم کرنے پر آمادہ ہے۔ لیگ میں اسے بحیثیت رکن شامل کرنے پر آمادہ ہے۔ اور مذاکرات کے ذریعے سلطان اور امام کے جھگڑے کا تصفیہ کرانا چاہتی ہے۔

امام غالب کے لئے بھی اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ سلطان قابوس سے صلح کرلیں۔ اس لئے کہ نہ صرف سعودی عرب بلکہ دوسری عرب حکومتیں بھی ان کی حمایت میں اب اس قدر سرگرم نظر نہیں آتیں۔ سلطان قابوس بھی صلح کے لئے رضامند ہیں۔ وہ برطانیہ کی سرپرستی سے محروم ہونے والے ہیں۔ برطانیہ خلیج فارس سے بستر بوریا لپیٹ کر واپس انگلستان جارہا ہے اس کی فوجیں بھی واپسی کے لئے خیمے لپیٹ رہی ہیں۔

اس سیاسی پس منظر میں عرب لیگ کی کوششوں سے مذاکرات کے لئے فضا ہموار ہوئی۔ چنانچہ ستمبر کے آغاز

بیروت کے عالیشان
ہوٹل میں مصالحت کے
مذاکرات ناکام ہوگئے

میں بیروت کے ایک شاندار ہوٹل میں مذاکرات کا آغاز ہوا۔ بیروت کے ہفت روزہ اخبار "الحوادث" اور شام کو شائع ہونے والے "سا البیروت" کے مطابق بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع ہوٹل ریویرا کے خوبصورت ہال میں اومان کے مسئلہ پر گفت و شنید کے لئے فریقین اکٹھا ہوئے۔ امام غالب کے ساتھ ان کے بھائی طالب بھی تھے۔ سلطنت اومان کی نمائندگی سلطان قابوس کے چچا شبیب بن تیمور اور سلطان کے مشیر اور رشتے کے بھائی شہاب بن طواقی نے کی۔ عرب لیگ کے نائب سیکرٹری جنرل نے اجلاس کی صدارت کی۔

مذاکرات کی تفصیل اس طرح بیان کی جاتی ہے یہ ستمبر کی ایک خوشگوار رات تھی۔ میز پر انواع اقسام کے کھانے چنے تھے۔ عمدہ فرانسیسی شرابیں موجود تھیں بحیرۂ روم کی لہروں کے ہلکے ہلکے شور میں گفتگو کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے لیگ کے سیکرٹری جنرل نے تقریر کی۔ انہوں نے عربوں کے مشترکہ دشمن اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں پر توجہ دلائی۔ عربوں کے اتحاد پر زور دیا۔ اومانی عوام کے محاذ آزادی کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے خطرے سے فریقین کو خبردار کیا۔ انہوں نے محاذ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ امام اور سلطان کا تنازعہ یوں ہی جاری رہا اور فوری طور پر صلح نہ ہوئی تو محاذ کو نہ صرف اس سے فائدہ پہنچے گا بلکہ دونوں اقتدار سے محروم ہوجائیں گے اومان پر محاذ آزادی کا قبضہ ہوجائے گا۔

طالب نے نائب سیکرٹری جنرل سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ امام غالب بھی سلطان کے ساتھ صلح کے لئے رضامند ہیں۔ سلطان کو چاہیئے کہ وہ امام کی سابقہ حیثیت تسلیم کرلیں۔ انہیں جبل اخضر کا مذہبی اور سیاسی رہنما مانیں۔ ان کے اختیارات بحال کریں۔ اگر یہ باتیں مان لی جائیں تو امام وطن واپس جانے پر آمادہ ہیں۔ شہاب بن طواقی نے حکومت اومان کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ سلطان قابوس امام غالب کے سابقہ اختیارات اور ان کا منصب بحال کرنے پر رضامند ہیں۔ مگر صورت وہی ہوگی جو تنازعہ سے پہلے تھی۔ یعنی امام غالب سلطان قابوس کو اومان اور مسقط کا جائز حکمران تسلیم کریں گے۔

مذاکرات جب اس مرحلے پر پہنچے تو یہ اندازہ ہوا کہ صلح کی گھڑی آپہنچی۔ مذاکرات میں شامل تمام ارکان کے چہروں پر اطمینان اور مسرت کی جھلک تھی۔ کھانا بڑی رغبت اور شوق سے کھایا گیا۔ فضا میں بے تکلفی تھی۔ گرم جوشی تھی، قہقہے تھے۔ اور ایک دوسرے کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ تھا۔ مگر امام غالب خاموش تھے۔ انہوں نے ابھی تک گفتگو میں براہ راست حصہ نہیں لیا تھا۔ جب ان سے اظہار خیال کے لئے کہا گیا تو انہوں نے دوسرے دن کے لئے اسے ملتوی کردیا۔

غرضیکہ دوسرے روز مذاکرات کی دوسری

امام غالب نے کہا "یہ شرط منظور نہیں تو شیل آئل کی ایجنسی دی جائے"

نشست شروع ہوئی - امام غالب نے اپنی تقریر شروع کی اس بات پر زور دیا کہ انہوں نے حق کے لئے اپنی جدو جہد کا آغاز کیا تھا - اس لئے انھوں نے سولہ برس جلاوطنی میں گزارے - مصیبتیں جھیلیں - تکلیفیں اٹھائیں - لیکن عرب اتحاد کی خاطر محاذ آزادی کے خطرے کے پیش نظر وہ سلطان کے ساتھ صلح کرنے پر آمادہ ہیں - وہ سلطان کو سلطنت اومان کا جائز حکمران بھی تسلیم کرلیں گے مگر یہ اسی صورت میں ہوگا جب ان کی دو بنیادی شرائط منظور کرلی جائیں -

شرائط کا ذکر سن کر فضا پر اچانک سنجیدگی چھاگئی - تشویش پیدا ہوئی کہ یہ شرائط کیا ہیں - مگر امام غالب نے اس روز شرائط نہ بتائیں - اس کے لئے انہوں نے مہلت طلب کی - اس طرح اجلاس پھر ملتوی ہوگیا مذاکرات کا جب تیسرا روز شروع ہوا تو اس روز بھی امام غالب نے تقریر کی - اس دفعہ ان کی تقریر میں خطابت کا رنگ نمایاں تھا - انہوں نے ایک بار پھر کہا کہ وہ حق کے لئے لڑ رہے ہیں - ان کی جدوجہد باطل کے خلاف اور حق کے لئے ہے - اور اس حق کے نام پر ان کا مطالبہ ہے کہ ان کی دونوں شرائط منظور کی جائیں - اور دونوں منظور نہ کی جاسکیں تو وہ اپنی ایک شرط سے صرف عرب اتحاد کے نام پر دستبردار ہونے کو تیار ہیں -

جب ان شرائط کے بارے میں پوچھا گیا تو کچھ دیر انہوں نے تامل کیا - پھر اپنی پہلی شرط کے بارے میں کہا کہ یہ بہت اہم اور بنیادی شرط ہے اور چونکہ وہ حق کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں لہذا اس کی اہمیت کو سمجھنے کی پوری طرح کوشش کی جائے - یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے - چند لمحوں تک سکوت رہا - یہ بڑا گہرا اور پراسرار سکوت تھا - آخر عرب لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل نے اس سکوت کو توڑا - امام سے دریافت کیا کہ وہ شرائط تو بتائیں -

امام غالب نے انتہائی سنجیدگی اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ ان کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اومان اور مسقط میں "پیپسی کولا کی ایجنسی" انہیں دی جائے اور اگر یہ شرط منظور نہ کی گئی تو وہ وطن واپس نہیں جائیں گے اور حق کے لئے جدو جہد کرتے رہیں گے - امام غالب اپنی شرط پیش کر کے بیٹھے ہی تھے کہ سلطان کے چچا شبیب بن تیمور کا چہرہ ایکبارگی سرخ پڑ گیا - انہوں نے شب سے خنجر نکالا اور سامنے میز پر رکھتے ہوئے غصہ میں کہا "اس کا فیصلہ میدان جنگ میں ہوگا" یہ سنتے ہی امام غالب اور طالب کے چہرے بھی سرخ پڑگئے - دونوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے - امام طالب نے بلند آواز سے کہا "ہاں اس کا فیصلہ میدان جنگ ہی میں ہوگا"

صورت حالات کے اس طرح اچانک بگڑ جانے سے عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل بہت پریشان ہوگئے - انہوں نے کسی نہ کسی طرح امام غالب اور طالب کو بیٹھنے پر رضامند کیا - مگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ پیپسی کولا کی ایجنسی مانگنے پر شبیب اس قدر برافروختہ کیوں ہوگئے - بعد میں عقدہ کھلا کہ شبیب کی ناراضگی کا سبب یہ تھا کہ ایجنسی ان کے پاس تھی اور وہ کسی قیمت پر اس سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے - غرضیکہ کچھ دیر تک فضا مکدر رہی پھر نائب سیکرٹری جنرل کے اصرار پر غالب نے اپنی دوسری شرط بتاتے ہوئے کہا کہ ان کی پہلی شرط اگر منظور نہیں تو انہیں اومان اور مسقط کی برطانوی تیل کمپنی شیل آئل کی ایجنسی دی جائے -

امام غالب نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ شہاب بن طواتی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں - انہوں نے بھی شب سے خنجر نکالا اور سامنے پھینکتے ہوئے کہا کہ "اس کا فیصلہ بھی میدان جنگ میں ہوگا" - معلوم ہوا کہ شہاب کے اس طرح چراغ پا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ شیل آئل کی ایجنسی ان کے پاس تھی جس کے بارے میں وہ کچھ سننے کے بھی روادار نہ تھے - ایک بار پھر امام غالب اور طالب اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے - دونوں نے شپاشپ کمر سے خنجر نکالے اور ہاتھ بلند کر کے خنجروں کو فضا میں لہراتے ہوئے کہا "ہاں فیصلہ میدان جنگ ہی میں ہوگا" - یہ کہتے ہوئے دونوں ہال سے باہر چلے گئے -

مذاکرات بیروت کی اس ناکامی کے بعد مسئلہ اومان کا نام "پیپسی کولا جنگ" مشہور ہوگیا -

سوروئنو (انڈونیشیا)

مترجم: ـــــــ شمیم صدیقی



ماؤزے تنگ اور انقلاب

مشرق سے نیا سویرا طلوع ہو رہا ہے
افق پر سُرخی پھیلی ہوئی ہے
پہاڑ کی چوٹیوں اور وادیوں پر
سُرخ پھریرے طوفان کا خیر مقدم کر رہے ہیں

۲ ـــــــ

انقلابی قطار در قطار پیش قدمی کرتے ہیں
مٹھیاں بلند کئے ہُوئے
دنیا عوام کی گرفت میں ہے
کتنی مضبوط ہے
فتح مند مسرت، انقلابی فوج کے لاکھوں جانثاروں کی
پوری دُنیا میں گونج پیدا کرتا ہُوا
زبردست موجوں کی مانند رواں دواں
عالمی انقلاب جست لگاتا ہے

۳ ـــــــ

ہمارے لئے
ماؤزے تنگ اور انقلاب
ماؤزے تنگ کے معنی انقلاب کے ہیں

۴ ـــــــ

زمین کا اِک اِک چپہ
قرمزی لالی سے دمک رہا ہے
پانچوں براعظموں میں طوفان گرج رہا ہے
ہم مضبوطی سے بندوق اُٹھائے ہُوئے ہیں
فتح کے پرچم کو بلند کرتے ہُوئے
مکمل اعتماد کے ساتھ
ہم چیختے ہیں
"سیاسی اقتدار بندوق کی نالی سے جنم لیتا ہے"
کامیابیوں اور ناکامیوں نے ہمیں سکھایا ہے
یہ واحد راستہ ہے
واحد اور ناقابلِ تقسیم
بندوق
اقتدار

۵ ـــــــ

ہمارے لئے
ماؤزے تنگ اور انقلاب
ماؤزے تنگ کے معنی انقلاب کے ہیں

۶ ـــــــ

مشرق سے نیا سویرا طلوع ہو رہا ہے
اُفق پر سُرخی پھیلی ہُوئی ہے
"دنیا نئی بنیادوں پر تعمیر ہو گی
پہلے ہم کچھ نہ تھے
اب ہم سب کچھ ہوں گے

یہ حقیر کیڑے نہیں — انسان ہیں

خدارا — میرا قصور بتائیے

فاروق پراچہ

"خدا کے لئے بتائیے! میں کیا کروں؟"

یہ جملہ ایک ایسے خط کا ہے، جو مجھے ان دنوں ملا جب میں ایک مقامی اخبار میں نفسیاتی الجھنوں کو حل کیا کرتا تھا۔ یہ خط اب تک میری فائلوں میں محفوظ ہے۔ خط لکھنے والا ایک تیس سالہ صحت مند اور خوبصورت مرد ہے، جسے اپنے ماں باپ کی تلاش ہے خط میں لکھا گیا تھا کہ

"میں ایک تعلیم یافتہ اور صحت مند مرد ہوں خدا کے فضل سے اچھی ملازمت حاصل کر چکا ہوں، شادی فی الحال نہیں کی اور نہ کبھی کرنے کا ارادہ ہے، میری زندگی کی کہانی بڑی المناک ہے، کیا آپ یقین کریں گے کہ مجھے میری پیدائش کے فوراً بعد کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا تھا۔ جہاں میں پولیس کی تحویل میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں سے ہوتا ہوا میں ایک سماجی ادارے کی عمارت میں پہنچا، جہاں میں نے اپنی زندگی کے پانچ سال گذارے، اس عرصہ میں مجھ پر کیا بیتی، اس کے ہلکے ہلکے نقش اب تک میرے ذہن پر ثبت ہیں، اس کے بعد ایک رحم دل خاتون آئیں اور مجھے اپنے ہمراہ گھر لے گئیں انہوں نے یقین جانیئے مجھ سے بے پناہ محبت کی، مجھے لکھایا پڑھایا اور اس قابل بنا دیا کہ میں زندگی کے پُرخطر راستوں پر آسانی سے سفر کر سکوں، یہ خاتون اپنی شادی کے سات سال تک اولاد سے محروم رہیں، ڈاکٹروں نے انہیں جواب دے دیا تھا، چنانچہ انہوں نے میری پرورش بالکل اپنی سگی اولاد کی طرح کی، میرے منہ بولے والد شہر کے ایک بہت بڑے تاجر تھے، وہ مجھ سے محبت ضرور کرتے تھے لیکن میں نے ان کی محبت میں اپنی منہ بولی ماں کی طرح اپنائیت کبھی محسوس نہیں کی، مجھے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اس بات کا احساس تھا کہ میں اپنے باپ ماں کے گناہوں کا نتیجہ ہوں، میرے کر دوست مجھے اس بات کا طعنہ دیتے، بچپن میں تو خیر میں نے ان کے طعنے اس کان سے سنے اور اس کان سے اڑا دیئے۔ لیکن جوان ہو کر یہ طعنے میرے کانوں میں جیسے پگھلتے ہوئے شیشے کی طرح داخل ہوتے تھے اس موقع پر میری منہ بولی ماں مجھے بہت دلاسہ دیتی لیکن جب آگ میں میں جل رہا ہوں اُسے شاید اب کوئی نہ بجھا سکے، مجھے اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ لیکن میں لوگوں کی مشتبہ نظروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، ہر آدمی جسے میری اصلیت کا پتہ ہے، مجھ سے کنی کتراتا ہے، جیسے میں اچھوت ہوں، میں ان حالات میں تنہائی پسند ہو گیا ہوں، میرا کوئی دوست کوئی ساتھی نہیں، اب آپ ہی خدا کے لئے بتائیے میں کیا کروں؟"

مجھے افسوس ہے کہ میں اس خط کا جواب نہیں دے سکا تھا اور جواب دیتا بھی تو کیا، ہمارا پورا معاشرہ آج تک ایسے خطوط کا جواب نہیں دے سکا، میں اکیلا بھلا اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟ ایک ماہر نفسیات کے کہنے کے مطابق جب تک معاشرے میں رہنے والے افراد اپنے جیسے گوشت پوست کے انسان کو اس کے ماں یا باپ کے گناہوں کا طعنہ دیتے رہیں گے اس وقت تک کوڑے کے ڈھیر بے جان اور جاندار لاشوں سے آباد رہیں گے، کیونکہ معاشرے کے قوانین کا خوف ہی عورت کو اپنی کوکھ سے جنم دینے والی ہستی کو کوڑے کے ڈھیر پر ڈالواتا ہے اب ذرا ایک خبر ملاحظہ فرمایئے۔

"آج صبح ایک نومولود بچہ نارتھ ناظم آباد سے کوڑے کے ڈھیر میں ملا۔ اس کی عمر تقریباً ایک ہفتہ ہے بتایا جاتا ہے کہ کسی بے رحم ماں نے بچہ کو غسل دے کر صاف ستھری سفید چادر میں لپیٹ کر ایک ٹوکری میں رکھ دیا۔ اس کے بعد ٹوکری گندگی کے ڈھیر میں رکھ دی، اس ٹوکری پر منوں کوڑا اور گندگی پڑی تھی، جب خاکروب گندگی اٹھانے میں مصروف تھا تو ٹوکری اس کے ہاتھ لگ گئی ٹوکری میں بچہ دیکھ کر ناظم آباد پولیس کو اطلاع دی گئی، پولیس نے بچہ کو فوراً اسپتال پہنچایا۔ بچہ زندہ تھا۔ اس کی ختنہ بھی کرا دی گئی تھی پولیس نے نامعلوم ماں کے خلاف مقدمہ درج کر کے اس کی تلاش شروع کر دی۔"

ہمارا معاشرہ کس تیزی سے بگڑتا جا رہا ہے۔ اس کا اندازہ گلیوں، سڑکوں اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں سے پائے جانے والے نومولود زندہ اور مردہ بچوں کی لاشوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ کراچی میں ایک اندازے کے مطابق اوسطاً ہر ماہ سڑکوں پر پندرہ سے بیس بچے یا تو زندہ ملتے ہیں یا ان کی لاشیں دستیاب ہوتی ہیں زندہ ملنے والے بچوں کی اکثریت مقامی ہسپتالوں میں فوت ہو جاتی ہے۔ جو بچے زندہ بچ جاتے ہیں۔ انکی پرورش پر خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ نتیجے میں ان کی اکثریت معذور ہو جاتی ہے۔ نوزائیدہ بچوں کی جو لاشیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان میں سے نوے فیصد سے زائد بچوں کو گلا گھونٹ

سنگدل ماں نے اس کا گلا گھونٹ کر کوڑے پر پھینک دیا

کر ہلاک کیا گیا۔ کچھ بچوں کی لاشیں ایسی بھی ملی ہیں جو پھینکے جانے کے وقت تو زندہ تھے۔ لیکن یا تو کسی زہریلے جانور کے کاٹنے سے مر گئے یا پھر طبعی موت مرے۔

کراچی جیسے بڑے شہر میں ایسے بچوں کے لئے صرف ایک ادارہ دارالاطفال موجود ہے۔ یہاں تین سو سے زائد بچے پرورش پا رہے ہے۔ یہ ادارہ ہمیشہ مالی مسائل سے دوچار رہتا ہے۔ شہر کے چند مخیر حضرات اس کی معاونت کرتے ہیں۔ لیکن تین سو بچوں کی پرورش کا بوجھ بہرحال ایک عظیم بوجھ ہے۔ اس ادارے کی منتظم مس رفعت نے مجھے ایک ملاقات میں بتایا کہ ہمارے ہاں کے بچوں کو مالی دشواریوں کے باوجود تمام بنیادی سہولیات میسر ہیں۔ ہم بہرحال انہیں والدین کا پیار تو نہیں دے سکتے لیکن کوشش کی جاتی ہے کہ انہیں والدین سے محرومی کا احساس نہ ستائے، اس ادارے میں پرورش پانے والے کئی بچے اب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر اچھی ملازمتوں پر مامور ہیں اور معاشرے میں ایک اچھی زندگی گذار رہے ہیں۔ مس رفعت نے بتایا کہ کئی ایسے والدین جن کی گود شادی کے سالوں بعد بھی ہری نہیں ہوتی۔ اس ادارے سے بچے لے جاتے ہیں، اور ان کی پرورش اپنے بچوں کی طرح کرتے ہیں۔" مس رفعت نے کہا کہ "اگر مخیر حضرات کو ہماری مالی پریشانیوں کا احساس ہو جائے اور وہ ہماری بھرپور معاونت کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بیک وقت ہزاروں بچوں کی نگہداشت بخوبی کر سکیں"۔

اس ادارے میں پرورش پانے والے ایک ۵ سالہ بچے نوید سے میں نے مختلف سوالات کئے، اسے والدین کی چاہت اور محبت کا کوئی احساس نہیں۔ وہ اپنی آیا کو ماں اور ادارے میں کام کرنے والے ایک ملازم کو اپنا باپ سمجھتا ہے۔ نوید ادارے کے اسکول میں پہلی جماعت کا طالب علم ہے۔ اس نے مجھے ا سے ی کری تک حروف تہجی اور ایک سے لے کر سو تک گنتی سنائی، وہ اپنے ادارے کا سب سے زیادہ ہنس مکھ، خوبصورت اور چاق و چوبند لڑکا ہے۔ مس رفعت کے بقول اسے کورنگی کے ایک کوڑے کے ڈھیر سے اٹھایا گیا تھا۔ سنگدل ماں نے اس کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ صرف بے ہوش ہوا تھا چنانچہ اسپتال میں اس کی مناسب نگہداشت سے اس کی زندگی بچ گئی۔

اس ادارے میں پرورش پانے والی ایک ۱۴ سالہ لڑکی ترانہ خاصی باشعور ہے۔ وہ اس سال میٹرک کا امتحان دینے والی ہے۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ اس کا کوئی گھر نہیں، وہ ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ میں نے جب اس سے شادی کے بارے میں رائے لی۔ تو وہ پہلے تو کچھ شرمائی پھر کہنے لگی "مس رفعت نے جہاں کہا وہیں شادی کرونگی"

ترانہ کو اس کی سنگدل ماں رات کی تاریکی میں ایک مسجد کے دروازے پر چھوڑ گئی تھی۔ پولیس نے اسے دارالاطفال پہنچایا۔ جہاں اس کا سارا بچپن گذرا ترانہ خاصی ذہین لڑکی ہے۔ نویں کے امتحان میں وہ پورے اسکول میں اوّل آئی تھی۔

دارالاطفال کے بچے بچیوں سے ملنے کے بعد مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہو چلا ہے کہ وہ اگر ہنستے بھی ہیں اور کھیلتے بھی ہیں۔ تو ان کے رویے اور کردار میں ایک قسم کی محرومی پوشیدہ ہے۔ ان کے قہقہوں میں مجھے وہ زندگی نہیں دکھائی دی جو معصوم

ترانہ ڈاکٹر بن کر بیمار معاشرے کا علاج کرنا چاہتی ہے

بچوں کے قہقہوں کا خاصہ ہے ایک دودھ پیتے بچے کو میں نے اس ادارے میں اپنی آیا کے ہاتھوں پٹتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ مجھے اس کا یہ پٹنا کچھ اچھا نہیں لگا۔ میں نے آیا سے اس بارے میں استفسار کیا تو وہ کہنے لگی "بابو جی! روتے ہوئے بچے اپنی ماں کے ہاتھوں بھی پٹ جاتے ہیں۔ اگر میں نے اسے ایک ہلکی سی چپت ماردی تو کون سا ظلم ہو گیا!" آیا ٹھیک کہتی ہے روتے ہوئے بچوں کو ان کی ماں بھی کبھی کبھار مار دیتی ہے۔ لیکن غیر کے ہاتھوں معصوم بچے کا پٹنا بہرحال کسی کو اچھا نہیں لگتا۔

صوبائی حکومت کے شعبہ سماجی بہبود کے ایک اعلیٰ افسر اور مشہور ماہر نفسیات جناب ظفر حیات دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ متوسط طبقے میں "کنواری ماؤں" کی تعداد زیادہ ہے۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے جناب ظفر حیات نے کہا کہ متوسط طبقہ اعلیٰ طبقے میں شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ بھاری جہیز تیار کرنے کی سکت نہیں رکھتا جس کی وجہ سے ان کی لڑکیاں بڑی عمر تک گھروں پر بیٹھی رہتی ہیں ان حالات میں لڑکیوں کا غلط راہوں پر نکل جانا کچھ بعید نہیں، اس کے برخلاف اعلیٰ خاندانوں میں اگر اس قسم کے گناہ پرورش پاتے بھی ہیں۔ تو اوّل تو وہ بھاری رقوم کے عوض ان کا اسقاطِ حمل کرایا جاتا ہے۔ ورنہ امیر خاندانوں کی لڑکیوں کی یوں بھی شادیاں ہو جاتی ہیں جناب ظفر حیات نے بتایا کہ اس سے بچے ہمیشہ احساسِ محرومی کا شکار رہتے ہیں۔ ہمارا ملک تو خیر اس معاملے میں خاصا پس ماندہ ہے۔ لیکن یورپی ممالک میں بھی جہاں ہر قسم کی سہولیات میسر ہیں۔ ایسے بچے معاشرے کے بندھے اصولوں کے تحت ہمیشہ ایک اذیت ناک زندگی گذارتے ہیں: تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کا ہر بڑا مجرم اپنے ماں باپ کے وجود سے نا آشنا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ احساس محرومی انسان کے ذہن کو اس حد تک زنگ آلود کر دیتی ہے کہ پھر وہ اچھے اور برے کی تمیز نہیں کر سکتا ایسے حالات میں لوگ غلط راہوں پر نکل جاتے ہیں

میرے سامنے اس وقت ڈبلیو ٹیلر کی زندگی کا دوسرا رُخ نامی کتاب موجود ہے۔ اس کتاب کے مطابق صرف لندن میں ہر سال ڈھائی سے تین ہزار، نیویارک میں پانچ ہزار، پیرس میں چار ہزار، ماسکو میں ڈیڑھ ہزار اور یورپ کے دوسرے بڑے شہروں میں سات ہزار سے دس ہزار تک غیر قانونی بچے جنم لیتے ہیں۔ اس کتاب میں پاکستان کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کی گئیں۔ لیکن ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ہر سال پانچ چھ سو غیر قانونی بچے پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان میں یہ لعنت صرف شہروں تک محدود ہے اگر خدانخواستہ دیہات بھی اس کی لپیٹ میں آگئے تو ہو سکتا ہے ہم اس معاملے میں یورپی ممالک کی صف میں شامل ہو جائیں۔

انسانی خون کی کمائی سے

کریسنٹ نے صنعتی میدان میں اپنے خونی پنجے گاڑ دیئے

الفتح رپورٹ

پاکستان میں کریسنٹ کو اس وقت ملک کا پانچواں سب سے بڑا سرمایہ دار ہونے کا شرف حاصل ہے ۱۹۵۵ میں پاکستان کی کاروباری دنیا میں ان کا بارہواں نمبر تھا اور ان کا اداشدہ سرمایہ صرف ۲۰ لاکھ تھا۔ پانچ سال بعد یہ سرمایہ ۱۷۰ لاکھ ہوا اور اگلے پانچ سال میں ۸۴۰ لاکھ تک جا پہنچا یعنی دس سال میں ۲۰ لاکھ سے ۸۴۰ لاکھ۔ اگر نوٹ بنانے کی مشین لگالی جائے تو بھی شاید اتنے تھوڑے عرصے میں اتنی ترقی ممکن نہ ہو اس لوٹ کھسوٹ میں گورنمنٹ کا ٹیکس بچا کر اسے کتنا نقصان پہنچایا گیا؟ کتنے دیانتدار اور فرض شناس افسران کو رشوت خوری کی عادت ڈالی گئی۔ ہماری سیاسی زندگی پر اثر انداز ہو کر کس کس طرح اس کے رگ و ریشے میں زہر بھرا گیا؟ کریسنٹ اور دوسرے بڑے سرمایہ دار گروپ ملک کی موجودہ سیاسی ابتری کے کس حد تک ذمہ دار ہیں؟ ان سب سوالات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہر باشعور پاکستانی ان سے بخوبی آگاہ ہے، آزادی سے پہلے کریسنٹ خاندان متحدہ ہندوستان میں کھالوں کے تاجر تھے۔ آزادی کے بعد یہ گروپ اپنا سرمایہ جو صرف ہزاروں میں تھا لے کر پاکستان پہنچا تو انہوں نے اپنے آبائی پیشے میں معمولی سی تبدیلی کی یعنی اب انسانی کھالوں کا کاروبار شروع کر دیا آتے ہی انہوں نے سٹے کے میدان میں قدم جمائے اور اس مذموم کاروبار کے ذریعے دیکھتے ہی دیکھتے کاٹن کنگ کہلانے لگے۔ پھر کوریا کی جنگ جہاں انسانوں کے لئے موت کا پیغام بن کر آئی کریسنٹ خاندان کے لئے دولت کے انبار لائی اور اس انسانی خون کی کمائی سے کریسنٹ نے صنعتی میدان میں اپنے خونی پنجے گاڑ دیئے۔

کریسنٹ گروپ مندرجہ ذیل چار کمپنیوں پر مشتمل ہے۔

(۱) پریمئر انشورنس
(۲) کریسنٹ ٹیکسٹائلز
(۳) کریسنٹ شوگر
(۴) کریسنٹ جیوٹ

۱۹۶۶ء میں ان چار کمپنیوں کا اداشدہ سرمایہ تقریباً ۸ کروڑ تھا۔ لیکن ASSETS کی قیمت ۲۲ کروڑ سے کم نہ تھی پریمئر انشورنس جب کریسنٹ کے قبضہ میں آئی تو اس کا اداشدہ سرمایہ صرف ۲۰ لاکھ تھا۔ کریسنٹ ٹیکسٹائل ۱۹۵۰ میں قائم ہوئی اور ۱۹ سال میں اس کا اداشدہ سرمایہ میں ۵۰۰ فی صد اضافہ ہوا یعنی ۲۰ لاکھ کے ۸۹۰ لاکھ کریسنٹ کے اداشدہ سرمایہ میں اضافہ کی رفتار یہ رہی۔

سال	کریسنٹ کا اداشدہ سرمایہ (کروڑوں میں)
۱۹۵۵ء	½
۱۹۶۰ء	۱
۱۹۶۵ء	۸
۱۹۶۹ء	۹

کریسنٹ کی "ترقی" میں، جو عوامل ممد و معاون ثابت ہوئے ان میں سٹہ بازی، ایکسپورٹ کی بے پناہ سہولتیں غیر ملکی قرضے اور پبلک اور نیم پبلک سیکٹروں کی خریداری کو بہت اہمیت حاصل ہے ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۹ء تک کریسنٹ خاندان کے پھیلاؤ کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انہیں کریسنٹ ٹیکسٹائلز کے لئے تازہ سرمایہ کی فراہمی کا اجازت نامہ مل گیا۔ اس طرح بعد میں کریسنٹ شوگر اور کریسنٹ جیوٹ کے لئے بھی نئے اجازت نامے حاصل کئے گئے۔ اس طرح عوام کی دولت کا سہارا لے کر اپنی دولت میں مزید اضافہ کیا گیا۔ کریسنٹ خاندان کے اداشدہ سرمایہ میں اضافہ کی سال بہ سال رپورٹ ملاحظہ ہو۔

سال	پریمئر انشورنس	کریسنٹ ٹیکسٹائلز	کریسنٹ شوگر	کریسنٹ جیوٹ	ٹوٹل
۱۹۵۴ء	۲۰	—	—	—	۲۰
۱۹۵۵ء	۲۰	—	—	—	۲۰
۱۹۵۶ء	۲۰	—	—	—	۲۰
۱۹۵۷ء	۲۰	—	—	—	۲۰
۱۹۵۸ء	۲۰	—	—	—	۲۰
۱۹۵۹ء	۲۰	۱۲۵	—	—	۱۴۵
۱۹۶۰ء	۲۰	۱۵۰	—	—	۱۷۰
۱۹۶۱ء	۲۰	۲۰۰	—	—	۲،۲۰
۱۹۶۲ء	۲۰	۲۵۰	—	—	۲،۷۰
۱۹۶۳ء	۲۰	۲۵۰	—	—	۲،۷۰
۱۹۶۴ء	۲۰	۲۵۰	—	—	۲،۷
۱۹۶۵ء	۲۰	۲۵۰	۳۴۵	۲۲۵	۸۴۰
۱۹۶۶ء	۲۰	۲۵۰	۳۴۵	۲۲۵	۸۴۰
۱۹۶۷ء	۲۰	۲۵۰	۳۴۵	۲۲۵	۸،۴۰
۱۹۶۸ء	۲۰	۳۰۰	۳۴۵	۲۲۵	۸۹۰
۱۹۶۹ء	۲۰	۳۰۰	۳۴۵	۲۲۵	۸،۹۰

۱۔ کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز

۱۹۵۴ میں اس مل کا افتتاح ہوا۔ اب اس میں ۴۷،۸۸۰ سپنڈل اور ۹۳۰ کھڈیاں ہیں شروع میں کریسنٹ ٹیکسٹائل مندرجہ ذیل تین

پہلے جانوروں کی کھالوں کی تجارت، اب انسانی کھالوں کا کاروبار

ذیلی کمپنیوں پر مشتمل تھی۔

۱۔ کریسنٹ شوگر مل اینڈ ڈسٹلری لمیٹڈ
۲۔ جوبلی سپننگ اینڈ ویونگ ملز لمیٹڈ
۳۔ کریسنٹ شپنگ لائنز لمیٹڈ

اب کریسنٹ شوگر مل اینڈ ڈسٹلری لمیٹڈ کو بالکل آزاد حیثیت حاصل ہے۔ جوبلی سپننگ میں ۲۰۰ کھڈیاں اور ۷۰۰ اسپنڈل الگ سے تھے ڈائنگ پرنٹنگ اور فنشنگ پلانٹ بھی اس میں ضم کر دیئے گئے۔ کریسنٹ شپنگ کی حیثیت ابھی تک ایک ذیلی ادارے کی ہے اور یہ شپنگ لائنز ساحلی تجارت میں بے پناہ منافع کما رہی ہے۔

کریسنٹ ٹیکسٹائل مل کی کل پیداوار کا ۱/۳ حصہ بونس سکیم کے تحت ایکسپورٹ کر دیا جاتا ہے اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی پاور لوم فیکٹریوں اور کھڈیوں پر بنا ہوا کپڑا سستے داموں خرید کر اسے فنش کیا جاتا ہے۔ اور پھر ایکسپورٹ کر کے چھوٹے صنعت کاروں کے حق پر بھی ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ جوبلی ٹیکسٹائل کریسنٹ ٹیکسٹائل سے بھی زیادہ یارن ایکسپورٹ کرتی ہے۔ کریسنٹ گروپ کو زرمبادلہ میں ہیرا پھیری کرنے پر موجودہ مارشل لاء کے دوران بھاری جرمانے کئے گئے۔

۲۔ کریسنٹ شوگر اینڈ ڈسٹلری

یہ مل ۱۹۵۹ء میں قائم ہوئی اور ۱۹۶۵ء میں کراچی سٹاک ایکسچینج کی فہرست پر آئی۔ اس مل کا جدید پلانٹ ہالینڈ سے خریدا گیا۔ اور اس کی قیمت PICIC کے ذریعے ادا کی گئی۔ اس میں روزانہ ۱۵۰۰ ٹن گنا استعمال ہوتا ہے اب یہ مقدار بڑھ کر ۲۰۰۰ ٹن روزانہ ہو چکی ہے اور اس اضافے کے لئے ایک بار PICIC کو نچوڑا گیا۔ اس کے بعد ۵۰۰۰ گیلن روزانہ شراب بنانے کے لئے ایک ڈسٹلری پلانٹ نصب ہوا۔ حسب معمول پھر PICIC کے دروازے کھٹکھٹائے گئے۔

گنے کا رس نچوڑنے کے بعد اسے ہارڈ بورڈ بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ہارڈ بورڈ کے پلانٹ کے لئے بھی آرڈر دے دیا گیا ہے۔ اس طرح اس پراجیکٹ کے ذریعے اب کوئی چیز بھی ضائع نہیں ہوگی۔ اور ساتھ ہی کریسنٹ کی دولت میں اضافے کی رفتار بھی تیز تر ہو جائے گی۔

۳۔ کریسنٹ پراڈکٹس لمیٹڈ

یہ مل ۱۹۶۴ء میں جڑانوالہ (لائلپور) میں قائم ہوئی اور ۱۹۶۵ء میں سٹاک ایکسچینج کی زینت بنی۔ دراصل یہ پراجیکٹ WPIDC نے تیار کیا تھا۔ لیکن بعد میں گورنمنٹ کی اجازت سے اسے محمد امین محمد بشیر کے حوالے کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں WPIDC اور محمد امین محمد بشیر کے درمیان

دس سال میں
بیس لاکھ سے
آٹھ سو چالیس لاکھ

ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے WPIDC نے دس فیصد اور محمد امین محمد بشیر نے ۴۰ فیصد سرمایہ لگایا۔ باقی ۵۰ فیصد پبلک شیئرز کی صورت میں حاصل کیا گیا۔ اس مل نے ۱۹۶۰ء میں پروڈکشن شروع کرنی تھی لیکن پاور نہ ملنے کی وجہ سے پورا سال ضائع ہو گیا

کریسنٹ جیوٹ پراڈکٹس نے دو عدد غیر ملکی قرضے حاصل کئے جن کی مجموعی مالیت ۲۳۶ لاکھ تھی اور یہی اس کمپنی کا ٹوٹل ادا شدہ سرمایہ تھا۔ اس طرح سے ہینگ پھٹکری لگائے بغیر محمد امین محمد بشیر عرف کریسنٹ گروپ غیر ملکی سرمایے کے بل بوتے پر امیر سے امیر تر بنتے چلے گئے

۴۔ پریمیئر انشورنس

نیم پبلک سیکٹر کی یہ کمپنی ۱۹۵۲ء میں قائم ہوئی اور اسی سال سٹاک ایکسچینج کی فہرست پر آگئی بعد میں چپکے سے کنٹرولنگ شیئرز کریسنٹ کی جیب میں پہنچ گئے اور ساتھ ہی کمپنی بھی ان کے گھر کی لونڈی بن گئی۔ ۱۹۶۶ء میں اس کمپنی کی ایسٹ پاکستان میں سات اور ویسٹ پاکستان میں آٹھ برانچیں تھیں اس کے علاوہ ایک برانچ بیروت میں بھی ہے۔ لائف کے کاروبار میں پالیسیوں کی تعداد کے لحاظ سے یہ کمپنی دسویں نمبر پر ہے جنرل کے کاروبار میں اس کا نمبر پانچواں ہے۔

کریسنٹ کی ان چار کمپنیوں میں ڈائریکٹروں کی کل تعداد ۳۶ ہے اس میں ۲۲ ڈائریکٹر کریسنٹ خاندان کے افراد ہیں۔ فہرست ملاحظہ فرمایئے۔

	کریسنٹ خاندان کے افراد	ڈائریکٹروں کی تعداد
۱	میاں محمد بشیر	۴
۲	میاں محمد سلیم	۴
۳	میاں محمد امین	۳
۴	میاں فضل کریم	۲
۵	میاں بخش الٰہی	۲
۶	میاں محمد شفیع	۲
۷	میاں مظہر کریم	۱
۸	میاں محمد انور	۱
۹	میاں محمد رفیع	۱
۱۰	میاں محمد ارشد	۱
۱۱	مقبول احمد	۱
	میزان	۲۲

کریسنٹ فیملی کے کرتا دھرتا میاں محمد بشیر ہیں جو چودہ ڈائریکٹر کریسنٹ خاندان کے گھر کے افراد کے علاوہ ہیں ان میں سے اکثریت کریسنٹ کے پرانے نمک خواروں کی ہے دوسرے بڑے گروپ جو کریسنٹ میں نمائندگی کر رہے ہیں ان میں سہگل اور رسول بخش سرفہرست ہیں کریسنٹ فیملی کے افراد بھوانی اور رنگینی گروپ میں بھی ڈائریکٹر ہیں۔

۶۳-۱۹۶۲ء میں کریسنٹ نے زیادہ سے زیادہ منافع تقسیم کیا اور اس کی شرح ۱۹ فیصد تھی، ۱۹۶۶ء میں یہ شرح کم سے کم رہی پھر بھی ۸ فیصد۔

عظیم جدوجہد آزادی

جب انقلابی لیڈروں نے چین کو لپیٹ میں لیا



"چین کی قسمت عوام کے ہاتھوں میں ہے چین مشرق کے ابھرتے ہوئے سورج کی مانند ہے اس کی کرنیں ملک کے کونے کونے کو منور کر دیں گی، عوام رجعت پسند، عوام دشمن حکومت کے باقیات کو مٹا دیں گے، جنگ کی تباہیوں کا ازالہ کر دیں گے اور ایک نئی طاقتور اور ترقی یافتہ عوامی جمہوریت کی تعمیر کریں گے۔" چینی کمیونسٹ پارٹی کے سرخ پرچم تلے چیئرمین ماؤزے تنگ نے آج سے اکیس سال پہلے یہ مارکسی لینینی پیش گوئی کی تھی۔ اکیس سال کے واقعات اس کا ثبوت ہیں کہ یہ پیش گوئی بالکل درست تھی۔ آج چین ایک عظیم طاقت کی حیثیت سے ابھر رہا ہے۔ وہ سرخ ستارے کی مانند چمک رہا ہے۔ اس کی روشنی سے نہ صرف ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ بلکہ پوری دنیا جگمگا رہی ہے۔ چیئرمین ماؤزے تنگ کی قیادت میں ایشیا نے اپنا سورج واپس لے لیا ہے۔ اب رہنمائی کے لئے مغرب کی جانب نہیں مشرق کی طرف دیکھنا پڑ رہا ہے چینی انقلاب صرف چین تک محدود نہیں رہا۔ ویت نام کی گرجتی توپوں، فلسطینی فدائین کی گولیوں کی تڑتڑاہٹ، لاطینی امریکہ کے جنگلوں اور افریقہ کے صحراؤں سے بلند ہونے والے نعروں کی گھن گرج اور توپوں کے دھماکوں میں چینی انقلاب کی ہی روح کام کر رہی ہے۔ آج چین آزادی، انقلاب اور سوشلزم کا نقیب ہے۔ اور سامراج، سوشل سامراج کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ،

یکم اکتوبر ۱۹۷۱ء کو چینی انقلاب کے اکیس سال پورے ہو رہے ہیں۔ ہم پاکستانی عوام کی جانب سے چینی کمیونسٹ پارٹی، چیئرمین ماؤزے تنگ اور چینی عوام کو سلام کرتے ہیں۔ اس موقع پر ہم چینی عوام اور چینی کمیونسٹ پارٹی کی عظیم انقلابی جدوجہد کی تاریخ نذر قارئین کرتے ہیں۔

وہاب صدیقی



ایک فرانسیسی راہب لیون نامی جو عوام دشمنی میں پیش پیش رہا

یکم مئی ۱۹۰۹ء کا ذکر ہے۔ سورج کی ضیاء بار کرنیں شہروں، دیہاتوں، باغات، کھلیانوں اور صحراؤں کو منور کر رہی تھیں۔ چین کے شمالی حصہ میں برف پگھل رہی تھی سردی اور برف باری سے اُکتائے ہوئے لوگ اپنے جسموں سے وزنی اُونی لبادے اتار رہے تھے کسل مندی دور ہو رہی تھی، بہار دھیرے دھیرے قدم رکھ رہی تھی۔ پیکنگ کے شاہی محل کے در و بام اور منقش کھڑکیاں سورج کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں، محل سے مذہبی پیشوا اور شاہی خاندان کی آہ و فغاں اور رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ امرا، مصاحب اور خواجہ سرا سیاہ لباس میں ملبوس تھے، سورج نصف النہار کی منزل طے کر کے پہاڑوں کی طرف چلا تو شاہی محل سے ایک جنازہ برآمد ہوا، ۱۲۰ مزدور اُسے کندھا دے رہے تھے توپوں کی سلامی کے بعد جنازہ ھمی لنگ کے شاہی قبرستان کی طرف روانہ ہوا، مذہبی پیشوا دعائیں پڑھتا ہوا آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کا چہرہ، جذبات سے عاری اور سپاٹ تھا، جیسے زبردستی یہ فریضہ انجام دے رہا ہو، پورے راستے فوج کے سپاہی قطار در قطار کھڑے تھے۔ عوام کا ایک ہجوم جنازے کے ساتھ تھا۔ یہ شاہ کوانگ سو کا جنازہ تھا۔

انیسویں صدی میں مغربی سامراجیوں نے چین پر پے در پے حملے کر کے مان چو حکومت کو کمزور کر دیا، مان چو حکمران اپنے ظلم و تشدد اور استحصال کی وجہ سے عوام میں پہلے ہی مقبولیت کھو چکے تھے۔ مغربی حملہ آوروں نے رہی سہی کسر پوری کر دی، استحصالی نظام کی کوکھ سے جو نفرت پیدا ہوئی۔ اس نے انقلابی تحریک کو جنم دیا، ڈاکٹر سن یات سین کی قیادت میں سامراجی مداخلت، چینی حکمرانوں اور چینی جنگ باز جاگیرداروں کے خلاف تحریک چلی، عوامی اُبھار پیدا ہوا۔ تو شاہ کوانگ سو نے چند اصلاحات نافذ کیں، ان اصلاحات سے براہ راست جنگ باز جاگیردار متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ بادشاہ کے دشمن بن گئے۔ انہوں نے شاہ کی چچی دواہگیر سے گٹھ جوڑ کر کے کوانگ سو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا، کوانگ سو کو شاہی محل میں نظر بند کر کے اصلاحات منسوخ کر دی گئیں۔

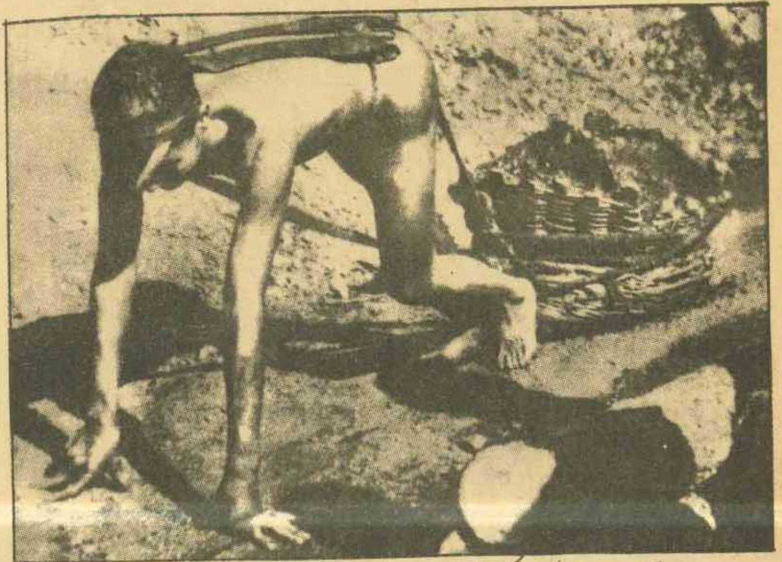
اتفاق دیکھیے جس دن گوانگ سو کا انتقال ہوا، اسی دن اس کی چچی دواہگیر بھی چل بسی — اور جنگ باز جاگیرداروں نے چار سالہ بچے۔ پو۔ وی کو چین کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس طرح اصل اقتدار چین کے جنگ باز جاگیرداروں کے پاس رہا انہوں نے دل کھول کر لوٹ کھسوٹ اور استحصال کیا۔ چینی انقلابی تحریک اور آگے بڑھی۔ لیکن ابھی تک یہ تحریک غیر منظم تھی۔ ہان جنگ اور دیگر دیہاتوں میں عوامی اُبھار زیادہ نہیں تھا۔ البتہ شہروں میں انقلابی تحریک جڑ پکڑ چکی تھی، اس زمانے میں ڈاکٹر سن یات سین پیرس میں تھے۔

مان چو حکومت کے اقتدار کا سنگھاسن ڈول رہا تھا اس موقع پر مغربی سامراجیوں نے مان چو حکومت اور جنگ باز جاگیرداروں کو اپنی اعانت کا یقین دلایا۔ امریکی فوجی ماہرین نے مان چو حکومت کے فوجیوں کو تربیت دی اور بھاری تعداد میں اسلحہ دیا۔ کنٹین، جاپان، سنگاپور، اور سائیگان میں چینی انقلابیوں کو کچلنے کے لئے منصوبے بنائے گئے، جاپان، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی فوجیں مان چو حکومت کی امداد کے لئے تیار کھڑی تھیں

جب چین میں انسانی جانیں سستی تھیں

قدیم چین میں انسانی جانیں سستی تھیں، ہر سال ہزاروں جانیں قحط اور وبائی امراض میں تلف ہو جاتی تھیں دوسری طرف شاہی خاندان اور جنگ باز جاگیردار، اپنے ظلم و تشدد، لوٹ کھسوٹ سے ہزاروں انسانوں کو مار ڈالتے تھے، ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۵ء تک آٹھ مرتبہ ہولناک اور تباہ کن قحط پڑا جس میں کم از کم پچاس لاکھ افراد ہلاک ہوئے، کان سو صوبے میں قحط، وبائی امراض، لوٹ مار اور جنگ کی وجہ سے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ کے دوران کل آبادی کا ایک تہائی حصہ ہلاک ہو گیا۔

چین میں مزدوروں سے غلاموں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ کوئلے کی کانوں میں چودہ چودہ برس کے لڑکے کام کرتے، ان سے بارہ گھنٹے کام لیا جاتا۔ صرف ایک لنگوٹ اور ایک ٹوپی پہن کر یہ کام کرتے، کوئلے کھودنے سے بار برداری تک کا کام ان ہی نوخیز لڑکوں سے لیا جاتا اور اگر وہ تھک کر گر پڑتے تو انہیں ہنٹروں سے مارا جاتا۔ اور اتنی سخت محنت کے بعد بھی انہیں اتنا معاوضہ نہیں ملتا تھا کہ وہ پیٹ بھر کر روکھی سوکھی کھا سکیں، قدیم چین میں یہ مشہور



قدیم چین میں کان کنی کے مزدوروں سے وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا



ڈاکٹر سن یات سین کابینہ کے وزیروں کے ساتھ کھڑے ہیں

تھا کہ کوئلہ کی کان کے مزدور کو ہمیشہ مانگے کا کفن ملتا ہے کیونکہ تمام عمر محنت کرنے کے بعد بھی مزدور اتنے پیسے جمع نہیں کر سکتا تھا کہ اس سے کفن دفن کا انتظام ہو سکے۔

۱۹۳۲ء میں برطانوی ماہر اقتصادیات آر، ایچ ٹاتے نے چین کے دیہی عوام کے حالات کو یوں بیان کیا ہے۔ چین میں سیلاب معمول بن گئے تھے، دیہاتی گلے گلے پانی میں کھڑے رہتے، یہاں تک کہ وہ پانی میں ڈوب جاتے۔ مزدوروں کے حالات بھی قابل رحم تھے۔ ۱۹۱۸ء میں پیکنگ کے قریب منتو کو میں جہاں کوئلہ کی کان تھی، تمام تر کام مزدوروں سے لیا جاتا تھا۔ کوئی مشین یا جانور استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر سن یات سین کی جمہوریہ چین کا قیام

چین عوام مغربی سامراجیوں اور مان چو حکومت کے ظالمانہ دور اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے ڈاکٹر سن یات سین کے زیر قیادت چلنے والی انقلابی تحریک پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ کارخانوں میں انقلابی جنگ کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، خفیہ اسلحہ خانوں میں دستی بم اور دیگر آلات حرب بنائے جا رہے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں اتفاق سے مان چو پولیس نے چھاپہ مارا لیکن پولیس کی آمد سے قبل ہی انقلابی اس جگہ کو چھوڑ چکے تھے۔ پولیس کو جلے ہوئے کاغذوں کی راکھ کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ راتوں رات انقلابیوں نے اپنے ہمدردوں سے رابطہ قائم کیا۔ اگلے دن ایک کارخانے کے انجینئروں نے اپنے حکام کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اور ہتھیار بند ہو کر سڑکوں پر نکل آئے انقلاب کے ابتداء کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ چینی عوام شاہی فوج کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے۔ شاہی فوج



ڈاکٹر سن یات سین کی بیوی

ڈاکٹر سن یات سین انقلابی تحریک کے عظیم قائد تھے

نے بھرپور مزاحمت کی لیکن انقلابیوں کے جذبہ آزادی کے سامنے ان کی ایک نہ چلی، بالآخر کچھ فوجی بھاگ گئے اور کچھ انقلابی صفوں میں شامل ہو گئے۔ اور جمہوریہ چین قائم کر دی گئی انقلابی لہروں نے چین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ البتہ شمالی چین میں انقلابی اثرات نمایاں نہ تھے۔ شمالی چین مان چو حکومت کے وزیر اعظم یان سی کائی کے زیر اقتدار تھا۔ وہ انتہائی ظالم اور طاقتور تھا۔ جنگ باز جاگیرداروں کا ایک طاقتور گروپ اس کا حمایتی تھا۔

ڈاکٹر سن یات سین جنہوں نے برس ہا برس سے مان چو حکومت کے خلاف جدوجہد کی تھی، انقلاب اکتوبر ۱۹۱۱ء کے وقت امریکہ میں تھے۔ انہیں یکم جنوری ۱۹۱۲ء کو جمہوریہ چین کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

جب انقلاب کی خبریں سات سمندر پار زیر تعلیم چینی طلباء کو معلوم ہوئیں تو وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر وطن واپس آ گئے اور تحریک آزادی میں شامل ہو گئے اور جمہوریہ چین کے قیام کے بعد وہ مزدوروں اور کسانوں میں کام کرنے لگے۔ اور اس طرح انہوں نے اپنے انقلابی ہونے کا ثبوت مہیا کیا۔ کیونکہ چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا ہے۔

"طالب علم کے انقلابی ہونے اور نہ ہونے کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ کس حد تک اپنے آپ کو مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ منسلک و مربوط کرتا ہے۔"

جمہوریہ چین کے قیام کے بعد ایک نمایاں تبدیلی یہ ہوئی کہ مان چو حکومت کے ظالمانہ دور میں کمیونسٹوں، قوم پرستوں اور عوام دوست افراد کو ایک خاص قسم کا لبادہ جیسے، کی پو کہا جاتا تھا زبردستی پہنایا جائے تاکہ لوگ انہیں دور سے شناخت کر لیں، عوام اس لباس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ چنانچہ جمہوریہ چین کے قائم ہوتے ہی اس لباس کو پہنانے کا رواج ترک کر دیا گیا۔

۱۹۱۷ء میں روس میں عظیم سوشلسٹ انقلاب برپا ہوا۔ اس کے دور رس اثرات چین میں بھی محسوس کئے گئے۔ ڈاکٹر سن یات سین اور چینی عوام سوویت یونین کے عظیم اکتوبر انقلاب سے بہت متاثر ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں مغربی سامراج اور جاپانی جنگ



یہ اُن دو چینی طالب علموں کی تصویر ہے جو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر انقلاب میں حصہ لینے کے لئے چین پہنچ گئے



ایک جنگی سردار ینگ یوسیانگ فوجی دستے کے سامنے تقریر کر رہا ہے۔



چانگ کائی شیک چینی عوام کا بدترین دشمن ہے

امریکی اور فرانسیسی سامراج، شاہی حکومت اور جنگی سرداروں کے سپاہیوں کو جدید اسلحہ اور وردی سپلائی کرتے تھے۔

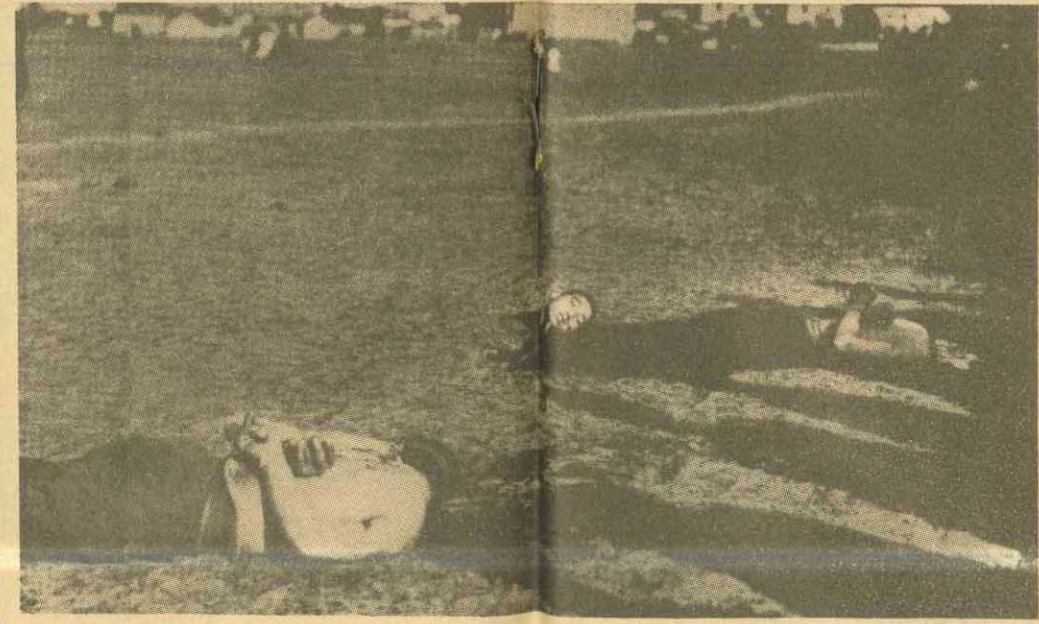
باز حکمرانوں کے خلاف چین میں ایک زبردست انقلابی لہر ابھری، ۱۹۲۰ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی وجود میں آئی۔ چینی کمیونسٹ پارٹی کا قیام چین کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اس پارٹی کے سرخ پرچم تلے عوام نے اپنی جدوجہد کے واضح مقاصد مرتب کئے، دوست اور دشمن کی تمیز کی اور انقلاب کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اور بتایا کہ انقلاب کشیدہ کاری کا نام نہیں، پینٹنگ کا نام نہیں، ڈنر ٹیبل پر بیٹھ کر انقلابی باتیں کرنے کا نام نہیں بلکہ انقلاب مارکسی لینینی نظریات سے مسلح ہو کر بندوقوں کے کندھوں سے صبح آزادی کے دریچوں پر دستک دینے کا نام ہے۔ انقلاب ایک تشدد آمیز عمل ہے جس کا مقصد سوشلسٹ معاشرہ اور پرولتاری آمریت قائم کرنا ہے۔ کمیونسٹوں نے ڈاکٹر سن یات سین سے تعاون کیا ۱۹۲۴ء میں کومنتانگ کی پہلی قومی کانگریس کا اعلامیہ کمیونسٹوں سے تیار کیا گیا۔ جس میں کہا گیا۔

”جدید ریاستوں میں نام نہاد جمہوری نظام پر عام طور سے بورژوازی کی اجارہ داری ہے اور یہ عام لوگوں پر تشدد کرنے کا صرف ایک ہتھیار بن کر رہ گیا ہے، دوسری طرف کومنتانگ کی جمہوریت کے اصول کا مطلب عام لوگوں کا مشترکہ جمہوری نظام ہے نہ کہ ایسا نظام جو چند لوگوں کی ذاتی ملکیت ہو۔“

۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر سن یات سین کا انتقال ہو گیا، چانگ کائی شیک جو کومنتانگ فوج کا سربراہ تھا، برسر اقتدار آیا۔ وہ کمیونسٹوں اور سامراج دشمن افراد کا جانی دشمن تھا۔ ڈاکٹر سین کی موجودگی میں وہ کچھ نہیں کر سکا، لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی چانگ کائی شیک نے چین کے جاگیرداروں اور جنگ باز زمینداروں سے گٹھ جوڑ کر کے کمیونسٹوں کے خلاف محاذ بنا لیا، اس طرح کومنتانگ میں پھوٹ پڑ گئی۔ ۱۹۲۶ء میں چانگ کائی شیک بھاری فوج کی جمعیت میں کینٹن سے شمال کی طرف



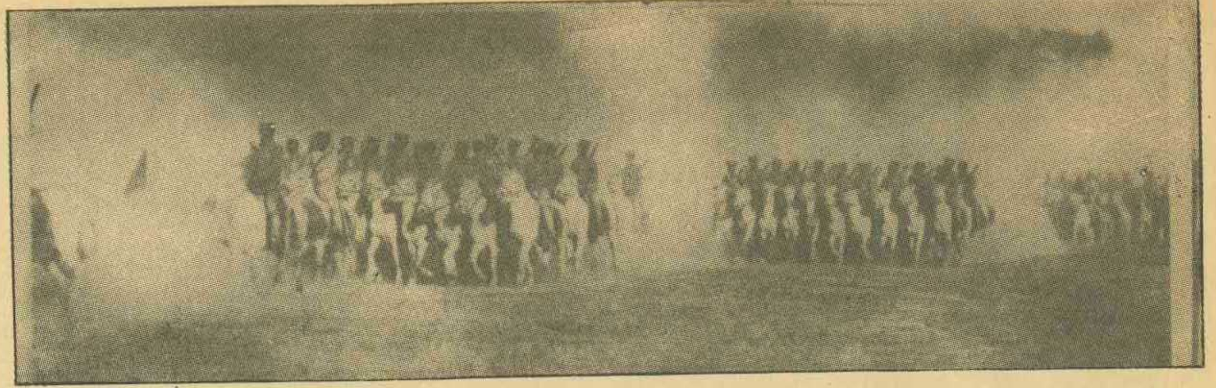
۱۹۲۷ء میں جنگی سردار چانگ سولن نے ڈکٹیٹر ہونے کا اعلان کیا



۱۹۲۶ء میں جب چیانگ کائی شیک نے ظلم و بربریت کی انتہا کر دی۔ یہ تصویر اس کے انتہائی ظلم کی ایک المناک داستان ہے



منچو کی ظالم حکومت کمیونسٹوں اور عوام دوستوں کو شناخت کرنے کے لئے ایک قسم کا سیاہ لبادہ زبردستی پہناتی تھی



شاہی حکومت کا ایک گھوڑ سوار دستہ، جسے انقلابیوں نے تہس نہس کر دیا

چینی عوام نے جاگیرداروں کے چھکے چھڑا دیئے

روانہ ہوا اور جلد ہی اپنی قوت میں دوگنا اضافہ کر لیا۔ اپریل ۱۹۲۷ء میں اس نے کمیونسٹوں کے خلاف اعلانیہ فوجی کارروائی کی ابتدا شنگائی سے ہوئی، سینکڑوں افراد کو دار پر لٹکا دیا گیا بعض کو پھانسی دینے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی، تلوار سے ان کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے اور ہزاروں افراد کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ بورودین اور ڈاکٹر سن یات سین کی بیوہ ماسکو فرار ہو گئی۔

چانگ کائی شیک چین کے جنگ باز جاگیرداروں اور سامراجیوں کی اعانت کی وجہ سے سمجھتا تھا کہ چین کے کمیونسٹوں کا صفایا کرنا دائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ خلاف توقع اسے کمیونسٹوں کی جانب سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ چین میں ماؤزے تنگ کمیونسٹوں کی قیادت کر رہے تھے۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں انہوں نے کنٹین پر قبضہ کر لیا لیکن دو دن کے بعد ہی گوریلا جنگ کی حکمت عملی کے تحت کنٹین چھوڑنا پڑا۔ چانگ کائی شیک نے کمیونسٹوں کی حمایت کرنے والوں سے اس طرح انتقام لیا کہ صرف ایک دن میں چھ ہزار افراد کے خون سے ہاتھ رنگے لاشوں کو چھکڑوں میں بھر بھر کر شہر سے باہر لے جایا گیا۔

چین جنگ باز جاگیرداروں کی لپیٹ میں

۱۹۳۰ء میں پیکنگ کے قریب ایک جنگ باز جاگیردار ہو چائی فو نے امریکی جدید اسلحہ سے لیس فوج تیار کی۔ ہو نے چین کے اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹۱۱ء کے انقلاب سے پہلے ہی چین کے جنگ باز جاگیردار نہایت طاقتور تھے، اماں جو حکومت کے زمانے میں ہر جاگیردار کو ذاتی فوج رکھنے کی اجازت تھی، ہنگامی حالات میں بادشاہ اس فوج کی حفاظت حاصل کرتا



امریکی سامراج کا پھوچیانگ کائی شیک

تھا۔ ان جاگیرداروں کو لوٹ کھسوٹ کرنے کی کھلی چھٹی تھی بادشاہ تو برائے نام تھا۔ ہر علاقے میں مقامی جنگ باز جاگیردار کا قانون چلتا تھا۔ ان جاگیرداروں کو اپنے اور اپنی فوج کے اخراجات کے لئے عوام پر ٹیکس لگانے کی اجازت تھی۔ عوام پر بے شمار ٹیکس عائد تھے۔ صوبے زی چوان میں ۱۹۲۴ء میں صرف نمک پر مختلف قسم کے ۲۷ ٹیکس لگائے گئے۔ عوام سے بار برداری کا کام لیا جاتا۔ اور اس کا معاوضہ بھی ادا نہیں کیا جاتا۔ ان کی زندگی کا انحصار لیٹرے، ظالم جاگیرداروں پر ہوتا تھا۔ یہ جنگ باز جاگیردار آپس میں بھی لڑتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۲۸ء تک ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی، ۱۹۲۰ء میں ایک سابق لیٹرے چانگ سولن ایک طاقتور جنگ باز جاگیردار کی حیثیت سے ابھرا۔ شروع میں اُسے جاپان کا تعاون حاصل تھا۔ اور منچوریا اس کا گڑھ تھا۔ چانگ کائی شیک اگرچہ جنگ باز جاگیرداروں کا دوست تھا لیکن وہ اپنا اقتدار مستحکم اور قائم رکھنے کے لئے ان جاگیرداروں کو آپس میں لڑاتا رہتا تھا۔ اور ان میں کمزور کر کے من مانی شرائط پر امداد دیتا تھا۔

(باقی آئندہ)



جنگی سردار چانگ سولین امریکی فوج کے ایک دستے سے سلامی لے رہا ہے۔



فارموسا کسی نئی خونریزی کے بغیر چین میں شامل ہو جائیگا

رحمٰن شفیع

چین اتنے قلیل عرصے میں جس تیزی کے ساتھ قوموں کی امامت اور دُنیا کی لیڈرشپ کی جانب رواں دواں ہے وہ ایک عظیم انسان ماؤزے تنگ کا مرہون منت ہے۔ بے شک ماؤ انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ دُنیا بھر کے مظلوم مجبور بے کس و بے نوا انسانوں کے دوست اور ان کے دشمنوں کے دشمن ہیں۔ دُنیا بھر کے مزدور کسانوں اور محنت کش ماؤزے تنگ کے علم و فکر اور عمل کو مشعل راہ بنائے ہوئے ہیں ساری دنیا کی بیواؤں کی نگاہیں اپنے بجھے ہوئے چولہوں کو جلانے کے لئے ساری دنیا کی مردانگی کا پیچھا کر رہی ہیں اور ساری دُنیا کی مردانگی اس تعاقب سے اپنا دامن چھڑا رہی ہے لیکن ایک مرد ایسا بھی ہے جس نے اپنے دامن کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے یہ دامن ماؤزے تنگ کا دامن ہے اور یہ مرد ماؤزے تنگ ہے۔ یہ دامن فکر و عمل کا ایک حسین امتزاج لئے ہوئے پھیل رہا ہے جو ہر طرح کے ظلم کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ اب تو اس کا اعتراف دشمنوں نے بھی کر لیا ہے۔ ولیم ایٹ وڈ (WLLIAMATTWOOD) ایک امریکی اخبار کا ناشر جس نے ابھی حال ہی میں چین کا مختصر دورہ کیا ہے لکھتا ہے۔

”جدید چین بنیادی طور پر ایک وسیع منظم اور تجرباتی اصلاحی مملکت ہے۔ اس پر ایک کریم النفس لیکن انانیت پسند بزرگ محافظ کا تسلط ہے جس نے وہاں کے رہنے والوں کو وقار، افتخار، سلامتی اور اتحاد و خلوص کا بے پایاں شعور بخشا ہے۔ چونکہ ان میں سے بیشتر ہر شے سے حتیٰ کہ عزت نفس سے بھی محروم تھے اس لئے محافظ کے لئے ان کا تشکر حق بجانب اور مخلصانہ ہے۔

اس تجربے کو کامیاب بنانے کے لئے ایک نئی قسم کا انسان تخلیق کرنا ضروری ہے“۔ ماؤ پرست انسان ”بے غرض بے لاگ“ اپنے ساتھیوں کا بہی خواہ اور سیاسی طور پر نیک کار ہے آپ کو ماؤ کی کتابوں میں نظریۂ فطرت انسانی پر کڑی نکتہ چینی ملے گی اور تمام اہل وطن ان کتابوں کی روشنی میں خود اس کا جائزہ لیتے ہیں کیونکہ وہ اس سے جد و جہد تنقید رد و استرداد اور تقلب ماہیت نامی طریقۂ اصلاح کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔ عنقریب یہ تجربہ غالباً قابل عمل ثابت ہو جائیگا ۱۳۰ سال قبل ”افیون“ کی جنگوں کے بعد سے پہلی بار چینیوں کا سر بلند ہوا ہے بیرونی ممالک میں خواہ انہیں قبول نہ کیا جاتا ہو لیکن ان کا احترام یقیناً کیا جاتا ہے اندرونی یا بیرونی طور پر کسی کے مقروض نہیں ہیں۔ پانچویں دہائی میں روسیوں کی علیحدگی کے بعد سے انہوں نے کوئی بیرونی امداد حاصل نہیں کی ہے وہ خود کفیل ہیں اور ان کی آمدنی اتنی ہے کہ بنیادی ضرورت کی اشیا سے بڑھ کر کچھ اور بھی خرید سکتے ہیں انتہا پسندی بھی ختم ہو چکی ہے اور ماؤ کی شخصیت کا پرچار بھی جو قوم کو متحد رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کم ہو رہا ہے اور یقیناً اس قائد بزرگ کی منشا ہی سے ایسا ہو رہا ہے۔ ایک سال پہلے کے مقابلے میں اب ان کی تعداد (مجسمے اور بیجز و بلّے) بہت کم ہو گئے ہیں۔

اس امر کا امکان ہے کہ چین سفارتی معاشی اور سیاسی طور پر عالمی امور میں ایک روز افزوں عملی منصب ادا کرے گا۔ پیکنگ میں مزید سفارت خانے اور تجارتی مشن قائم ہوں گے پیش کرنے پر چینی اقوام متحدہ کی رکنیت قبول کرے گا۔ لیکن دو چین یا علیحدہ فارموسا کی کوئی مصالحتی تجویز قبول نہیں کرے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ چیانگ کائی شیک کے مرنے کے بعد بلکہ اس سے بھی قبل ہی کسی قسم کے کشت و خون کے بغیر فارموسا چین میں دوبارہ شامل ہو جائے گا۔“

ابھی حال ہی میں راقم الحروف کے ایک رشتے کے بھائی ۱۲ سال امریکہ میں رہنے کے بعد جب مختصر دورے پر پاکستان آئے تو میں نے انہیں دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملک میں رہنے پر مبارک باد پیش کی جہاں سائنسدانوں، مفکروں، مدبروں اور فلسفیوں کی بھر مار ہے۔ اس پر انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں امریکہ کی طرف نہ دیکھوں انہوں نے کہا کہ ”چین کی طرف دیکھو اور چین سے روشنی لو چین ابھر رہا ہے چین ابھر رہا ہے“۔ میرے بھائی کے انداز فکر نے میرے خیالات کو اقبال کی طرف موڑ دیا۔ مجھے اقبال یاد آیا جس نے کہا تھا ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے۔

اقبال نے چین کے بارے میں مزید یہ کہا ؎

گرفتہ چینیاں احرام مکی خفتہ در بطحی

لیکن بدقسمتی سے ہماری زمین نے اقبال کے بعد ایک بھی ایسا مفکر پیدا نہ کیا۔ جو اقبال کی فکر کو آگے بڑھاتا ایسا کہتے ہوئے میں منافقت نہیں کر رہا ہوں ہمارے سارے دانشور (مجھے شرم آتی ہے) جن میں ایک بھی منفرد نہیں ہے، ایک طرف اپنی ساری توجہ ”پاجامہ شیروانی سوٹ اور سنیچ کرتے ہوئے ناٹ میں صرف کرتے ہیں اور دوسری طرف فکر اور دلیل کی کسوٹی کو اتار کر پھینک دیتے ہیں۔ اقبال کے لڑکے بھی یا تو خاموش ہیں یا وہ اقبال کے انقلابی پیغام اور تعلیمات کے پہیئے کو پیچھے کی طرف گھسیٹ رہے ہیں ؏

روؤں میں اپنے دل کو کہ پیٹوں جگر کو میں

آخر میں اقبال کا تذکرہ کرنے پر میں پھر مجبور ہوں جس نے کارل مارکس کے بارے میں کہا تھا ؎

؏ قلب او مومن دماغش کافر است

اور میں پورے یقین کے ساتھ ماؤزے تنگ کے بارے میں کہتا ہوں۔

؏ قلب او مومن دماغش مومن است

پیکنگ سے شاؤ شان تک

شیا چاؤ کمیون کے باشندے

ماؤزے تنگ کے افکار کی روشنی میں آگے بڑھ رہے ہیں

شیا چاؤ کمیون کا ایک دلکش منظر

پیکنگ سے احفاظ الرحمٰن نے لکھا

سن تا کاؤنٹی بھی کوانچو کے مضافات میں واقع ہے اس کاؤنٹی کا شیا چاؤ کمیون خاص طور پر ماہی گیری کے لئے بہت مشہور ہے، اسی لئے اسے ماہی گیری کا کمیون بھی کہتے ہیں. خاصا لمبا سفر تھا، وہاں پہنچتے پہنچتے تقریباً تین گھنٹے لگ گئے. انقلابی کمیٹی کے کارکن ہمیں اپنے دفتر میں لے گئے، یہ دفتر ایک تھیٹر کی بالائی منزل پر ہے. سیڑھیاں چڑھتے وقت ہم نے اس تھیٹر پر ایک اچٹتی نظر ڈالی. تین چار سو بنچیں پڑی ہوئی تھیں، اسٹیج پر کوئی پردہ نہیں تھا. بالکل سادہ سا تھیٹر تھا. ویسا ہی جیسا کہ کسی قصبے کا ہو سکتا ہے. یہاں وہ فلمیں دکھاتے ہیں. ثقافتی پروگرام پیش کرتے ہیں اور سیاسی جلسے منعقد کرتے ہیں. سب سے پہلے انقلابی کمیٹی کے ایک رکن نے اپنے کمیون کا تعارف کرایا اور آخر میں کہا کہ "ہمارے کام میں بہت سی خامیاں موجود ہیں. ہم نے ابھی انسانیت اور بین الاقوامیت کے لئے اپنا کردار اچھی طرح ادا نہیں کیا. اس لئے آپ ہمارا کمیون دیکھنے کے بعد ہم پر تنقید کریں"! یہ الفاظ آپ کو ہر میدان میں، ہر چھوٹے بڑے یونٹ میں سننے کو ملیں گے میں اس ڈھائی سال کے عرصے میں جہاں کہیں گیا یہ الفاظ ضرور سننے کو ملے. پھر یہ الفاظ رسمی طور پر نہیں کہے جاتے. بلکہ اس میں انکسار اور خلوص کی جھلک ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی کو ماؤزے تنگ کی تحریروں کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور ماؤزے تنگ کا کہنا ہے کہ "انکساری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو، ایک دوسرے سے سیکھنے کی کوشش کرو، کوئی شخص حقیر نہیں ہوتا. چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ چین میں جہاں طالب علم استاد سے سیکھتا ہے وہیں استاد طالب علم سے سیکھتا ہے. مزدور ٹیکنیشین سے سیکھتا ہے اور ٹیکنیشین مزدور سے سیکھتا ہے. ہمارا دفتر اس وقت ایک اسکول کی عمارت میں ہے. ایک دن اسکول کے بچوں کو فائر بریگیڈ کے عملے نے آگ بجھانے کے اصول سکھائے. بڑے سے میدان میں چھوٹے بڑے بچے جمع تھے. فائر بریگیڈ کی گاڑی آئی اور اس میں سے عوامی بیا آزادی کے سپاہی نیچے اترے تو تمام بچوں نے زور زور سے نعرے لگائے: "شیانگ چے فان چون شولے شی" (سپاہیوں سے سیکھو) اس کے جواب میں سپاہیوں نے اپنی جیبوں سے سُرخ کتابچے باہر نکالے اور انہیں لہراتے ہوئے بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ نعرہ لگایا: "شیانگ شاؤ پھینگیو شولے شی" (ننھے دوستوں سے سیکھو)

شیا چاؤ کمیون میں تقریباً پندرہ ہزار گھرانے آباد ہیں اور اس کی کل آبادی ۶۵ ہزار ہے. یہاں کی زمین اٹھارہ ہزار مو ہے اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ آمدنی ماہی گیری اور ریشم کے کیڑوں کی افزائش ہے. اس کے علاوہ وہ گندم چاول اور گنا بھی اگاتے ہیں، آج کل وہ دھان اور گنا ایک ساتھ اگانے کا تجربہ کر رہے ہیں. آزادی سے قبل یہ علاقہ بھی مختلف طبقوں میں بٹا ہوا تھا اور یہاں بھی ایک چھوٹا سا طبقہ بڑے طبقے کا استحصال کیا کرتا تھا. اس وقت یہاں کل چودہ ہزار گھرانے آباد تھے. جن کی طبقاتی تقسیم کچھ اس طرح تھی.

ادنیٰ غریب کسان	۸۸۳۱	گھرانے
متوسط کسان	۱۷۵۶	گھرانے
امیر کسان	۲۶۵	گھرانے
زمیندار	۳۶۴	گھرانے
سرمایہ دار	۱۳	گھرانے
مزدور، تاجر، دوکاندار وغیرہ	۲۰۰۰	گھرانے



شیا چاؤ کمیون کے ماہی گیر مچھلیاں پکڑ رہے ہیں

صدر ماؤ نے ہمیں دکھوں سے نجات دلائی اور طبقاتی تعلیم دی

(یہاں وہ سرمایہ دار اس شخص کو قرار دیتے ہیں، جس کے پاس دو ہزار روپے نقد اور ۳ مزدور ہوں)

غریب کسان اناج کے ایک ایک دانے کو ترستے تھے، ان کے سامنے زمینداروں کے گودام بھرے رہتے تھے۔ اور اگر وہ ان سے مدد کی درخواست کرنے ان کے دروازے پر جاتے تھے تو وہ ان کو ہزاروں مغلظات سناتے تھے اور ان پر اپنے خونخوار کتے چھوڑ دیتے تھے۔ انقلابی کمیٹی کے نمائندوں نے کہا کہ "ہم وہ زمانہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ جب ہم ان دنوں کو یاد کرتے ہیں، تو ہمارا طبقاتی شعور اور بلند ہو جاتا ہے۔ ہم صدر ماؤ کے احسان مند ہیں کہ انہوں نے ہمیں دکھوں سے نجات دلائی اور ہمیں طبقاتی تعلیم دی، ہم ایک بوڑھی کسان عورت کے گھر گئے۔ اس کا نام لاؤ چینگ ہے۔ اور اس کی عمر تقریباً ۶۳ سال ہے۔ ہمارے یہاں کی بوڑھیوں کی طرح بڑی بے تکلفی سے سادہ سے الفاظ میں اس نے ہمیں اپنی کہانی سنائی۔ "اس وقت ہم ایک دوسری کاؤنٹی میں رہتے تھے۔ میرا باپ ایک غریب کسان تھا۔ اور ایک زمیندار کی زمینوں پر کام کرتا تھا۔ ہمارے خاندان کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا تھا۔ ہم سسک سسک کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ میں بہت چھوٹی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہمارا جرم کیا تھا۔ جاپان کے خلاف جنگ مزاحمت کا دور تھا۔ اس وقت یہاں کومنتانگ کا راج تھا۔ حاکم صرف زمینداروں کی بات سنتے تھے۔ ایک بار معمولی سی بات پر کومنتانگ کے قزاقوں نے میرے باپ کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔ ماں پہلے ہی فوت ہو چکی تھی۔ میں اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ اس وقت میں صرف چھ سال کی تھی۔ نہ جانے کیسے بھٹکتے بھٹکتے میں یہاں آگئی۔ یہیں جوان ہوئی اور یہیں میری شادی ہوئی، ہم لوگ بہت غریب تھے۔ ہم دونوں کام کرتے تھے۔ لیکن ہم نے کبھی خوشی کی جھلک تک نہیں دیکھی۔ ہم چیتھڑے پہنتے تھے۔ جب میرا پہلا بچہ پیدا ہوا تو ہمارے پاس ایک پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ میں نے اسے کپڑے میں لپیٹا اور اُسے ایک سڑک پر رکھ کر چلی آئی۔" پرانے دنوں کی تلخ زندگی کے واقعات سنانے کے بعد وہ تھوڑی سی دیر دم لینے کو رکی اور نمناک آنکھوں سے ہماری طرف دیکھنے لگی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ شاید اس کا ذہن اپنی نئی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ "آزادی کے بعد دنیا بالکل بدل گئی۔ خون آشام بھیڑیوں کا صفایا ہو گیا اور اقتدار غریب کسانوں کے پاس آگیا۔ اب ہم سر اُٹھا کر چل سکتے تھے۔ میں ریشم کے کارخانے میں کام کرنے لگی۔ ہمیں پیٹ بھر کھانا ملنے لگا۔ اب ہم اچھی طرح اپنا تن ڈھانپ سکتے تھے۔ ہماری آمدنی اتنی معقول تھی کہ ہم نے بہت جلد خود اپنا مکان بنا لیا۔"

یہ مکان کافی کشادہ ہے۔ تین کمرے ہیں۔ صاف ستھرے، روشن ہوادار۔ دیواروں پر جا بجا اس گھرانے کے محسن ماؤزے تنگ کی تصویریں اور اقوال لگے ہوئے تھے۔ لاؤ چینگ پچاس سال کی عمر میں ریٹائر ہو گئی تھی۔ اب اسے پنشن ملتی ہے اور وہ گھر پر ہی رہتی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ چھوٹا بیٹا عوامی سپاہ آزادی میں کام کرتا ہے۔ اس نے مشرقی ماؤں کی طرح بڑے چاؤ سے بتایا کہ "ابھی حال ہی میں اس کے چھوٹے بیٹے کی شادی ہوئی ہے"۔ اس کے بعد اس نے نو بیاہتا جوڑے کا کمرہ بھی دکھایا۔ ایک چھوٹا سا خوب صورت کمرہ تھا۔ جس میں تمام ضروری سامان موجود تھا۔ فرنیچر، ریڈیو، گھڑی، ریشمی رضائیاں، خوب صورت پردے، الماری، کرسیاں، پلنگ۔

اب اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ایک شفیق ماں کی طرح اس کا جھریوں والا چہرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شاید مجھے اپنے ملک کے کروڑوں مرجھائے چہرے یاد آگئے تھے۔ میں لاؤ چینگ کی روشن، مسکراتی آنکھوں کی طرف نہیں دیکھ سکا اور جلدی سے باہر نکل آیا۔

یہ علاقہ ہمیشہ خشک سالی کا شکار رہتا تھا۔ بیشتر زمینیں بنجر تھیں۔ اور ان پر کسی چیز کی کاشت نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ۱۶۵۰۰۰ کیوبک میٹر زمین کھود کر چالیس لاکھ مو زمین پر مٹی کی نئی تہیں بچھائیں۔ اور انہیں قابل کاشت بنا لیا۔ انہوں نے محض افرادی قوت کے ذریعے ۶ بڑی نہریں تعمیر کیں۔ اس کے علاوہ ۱۷ نہری نالے بھی کھودے جن کی مجموعی لمبائی ۴۳ کلو میٹر ہے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے کارخانوں کی ضروریات کے پیش نظر ۸ پاور اسٹیشن بھی تعمیر کیے۔ آج یہاں کی ہر گلی اور ہر مکان روشنی سے جگمگاتا ہے۔ ۱۹۶۹ء کے مقابلے میں ۱۹۷۰ء میں مچھلی کی پیداوار میں ۴۰ فی صد اور ریشم کے کویوں کی تعداد میں ۲۳ فیصد اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں سال رواں میں مچھلی کی پیداوار میں اب تک ۱۰ فیصد اضافہ ہو چکا ہے۔ ثقافتی انقلاب سے پہلے یہاں صرف ایک اسکول تھا اور وہ بھی پرائمری۔ اب ہر بریگیڈ میں ایک جونیئر مڈل اسکول اور کمیون کی سطح پر ایک مڈل اسکول موجود ہے۔ چھوٹے بچوں کے لئے ایک نرسری بھی موجود ہے۔ ثقافتی انقلاب کے دوران کل ۲۴، اسکول تعمیر کئے گئے۔ اس طرح پہلے یہاں قدیم چینی طب جاننے والے سات حکیم موجود تھے۔ اب یہاں چھوٹے بڑے ۴۸ ۲ طبی مراکز قائم کئے جا چکے ہیں اور ہر بریگیڈ میں دو تین "برہنہ پا" ڈاکٹر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کمیون کی سطح پر ایک مرکزی ہسپتال بھی موجود ہے۔ یہاں مختلف قسم کے آپریشن بھی کئے جاتے ہیں۔ کمیون میں اس ہسپتال کی تین شاخیں موجود ہیں۔

یہاں ہر طرف مکانوں کے گرد چھوٹے نہری نالوں کا ایک سلسلہ بچھا ہوا ہے۔ جگہ جگہ کشتیاں چلتی نظر آتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کا سا سماں نظر آتا ہے۔ بہت خوب صورت سرسبز علاقہ ہے۔ گلیاں بہت تنگ سی تھیں اور ان پر سُرخ اینٹیں بچھی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ درخت لگے ہوئے تھے۔ بیشتر مکانات کی چھتیں سُرخ کھپریل کی تھیں۔ ہم جہاں جاتے ہیں بہت سے



احفاظ الرحمٰن کسان تحریک انسٹی ٹیوٹ کے احاطے میں صدر ماؤ کا مجسمہ نظر آرہا ہے۔

چین میں

طالب علم استاد سے

اور استاد

طالب علم سے سیکھتا ہے



کوانگچو الیکٹرک مشینری پلانٹ۔ طالب علم سانچوں کی ڈھلائی کا کام کر رہے ہیں

لوگ گھیر لیتے۔ چاروں طرف سے بچے بوڑھے، جوان ہماری طرف امڈ پڑتے۔ اتنی ساری آنکھیں ہماری طرف دیکھ رہی تھیں اور ہم بُری طرح جھینپ رہے تھے۔ ماؤزے تنگ کا مشہور قول ہے "ہر ملک خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا اپنی اپنی اچھائیاں اور برائیاں رکھتا ہے"۔ شاید وہ ہم غیر ملکیوں ہی جن کے ذہنوں میں سرمایہ دارانہ معاشرے کی چھاپ لگی ہوئی ہے کچھ اچھائیاں تلاش کر رہی تھیں۔

سب سے پہلے ہم ایک تالاب پر گئے۔ جہاں مچھلیاں پکڑی جا رہی تھیں۔ تالاب زیادہ گہرا نہیں تھا۔ پانچ، چھ مچھیرے پانی میں کھڑے ہوئے تھے۔ اور جال پکڑے دھیرے دھیرے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب وہ کنارے پر آئے تو پورا جال چھوٹی بڑی مچھلیوں سے بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے تمام چھوٹی مچھلیاں دوبارہ پانی میں ڈال دیں۔ اور بڑی مچھلیاں کنارے رکھے ہوئے ڈولوں میں ڈالنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے سارے ڈول مچھلیوں سے بھر گئے۔ لنچ پر ان میں سے بعض مچھلیاں ہمارے حصے میں بھی آئیں۔ پورے بریگیڈ میں ایسے بہت سے تالاب موجود ہیں اس کے علاوہ دریا میں کشتیوں سے بھی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ یہاں کی بیشتر مچھلیاں کوانگچو بھیجی جاتی ہیں۔

اس کے بعد ہم نے ریشم کا کارخانہ دیکھا۔ یہ ایک بہت بڑا کارخانہ ہے اور اس بریگیڈ کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ یہ کارخانہ آزادی سے قبل قائم کیا گیا تھا۔ پہلے اس میں صرف دو سو افراد کام کرتے تھے۔ اور اب نو سو افراد کام کرتے ہیں۔ اس کارخانے کی سالانہ آمدنی تقریباً ۲۴ لاکھ یوان (۴۸ لاکھ روپے) ہے اس کارخانے میں مختلف شعبے ہیں۔ ایک شعبے میں مشینوں کے ذریعے ریشم کے کویوں سے دھاگا نکال کر چکریوں میں لپیٹا جاتا ہے۔ دوسرے شعبے میں ان کو لچھوں کی صورت میں باندھا جاتا ہے اور تیسرے شعبے میں ایک خود کار مشین کے ذریعے ان کی کوالٹی کا تعین کیا جاتا ہے۔ ایک مزدور نے مجھے بتایا کہ عام طور پر ایک چھوٹا سا لچھا بیس پونڈ وزن سہار سکتا ہے میں نے بیس پونڈ وزنی ایک پتھر میں، جو خاص اسی مقصد کے لئے بنایا گیا ہے۔ ایک چھوٹا سا لچھا ڈال کر اسے اوپر اٹھایا تو اس کا تو کچھ نہیں بگڑا البتہ میری انگلیوں پر گہرے نشان پڑ گئے جن میں دیر تک جلن ہوتی رہی۔ بہر حال کوالٹی کا تعین کرنے کے بعد ان کی پیکنگ کی جاتی ہے۔ چھوٹے بڑے پیکٹ بنائے جاتے ہیں۔ اور حکومت کے متعلقہ شعبے کو روانہ کر دیئے جاتے ہیں۔ جو ضرورت کے مطابق انہیں اندرون ملک مختلف کارخانوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ یا دساور کو بھیج دیتا ہے، اس کارخانے میں زیادہ تر عورتیں کام کرتی ہیں۔

دوپہر کا کھانا ہم نے اسی کارخانے میں کھایا۔ سوپ سمیت تقریباً تمام کھانے مچھلی کے تھے۔ کھانے کے بعد ہم نے کلب میں اس کارخانے کے مزدوروں کے ساتھ ٹیبل ٹینس اور بیڈمنٹن کھیلی۔ وہ ہماری زبان نہیں جانتے تھے۔ اور ہماری چینی بھی "ترکی تمی دانم" کے مترادف تھی، لیکن ہم ان کی اور وہ ہماری آنکھیں پڑھ سکتے تھے۔ جن میں دوستی کے گہرے جذبات جھلک رہے تھے۔ "ہم مل کر ظالموں کے خلاف لڑتے ہیں اور ہر منصفانہ جدوجہد میں ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں" — یہ ایک چھوٹا سا ہال ہے۔ جس میں ایک اسٹیج بھی بنا ہوا ہے۔ یہاں ان کی میٹنگیں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ثقافتی پروگرام بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ اور فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ کچھ دیر آرام کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ مزدوروں نے باہر نکل کر اپنے سرخ کتابچے لہراتے ہوئے مشہور گیت "تا ہائے ہان شنے کھاؤ تو شو" (سمندر میں سفر کا انحصار ناخدا پر ہے اور انقلاب کا انحصار ماؤزے تنگ کی فکر پر ہے — یہ نائب صدر لن پیاؤ کا ایک قول ہے۔ جسے گیت کی شکل دے دی گئی ہے) گاتے ہوئے ہمیں رخصت کیا۔

واپسی پر ہم نے بچوں کی نرسری دیکھی جو کارخانے سے سو پچاس گز کے فاصلے پر ہے۔ ننھے منے بچے رنگ برنگ کپڑے پہنے ہوئے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ یوں بھی چینی بچے بڑے بھولے بھالے ہوتے ہیں؛

وہ باہر کھڑے ہوئے ایک آواز میں زور زور سے چیخ رہے تھے۔ شوشو، آئی نی ہاؤ! شوشو، آئی نی ہاؤ!! (چچا خالہ آداب! چچا خالہ آداب!!) ان بچوں نے ہمارے سامنے ایک مختصر سا ثقافتی پروگرام پیش کیا۔ ہم ان کے سامنے انہی کی ننھی منی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں، استانیاں ساز بجا رہی تھیں انہوں نے پیکنگ اوپیرا کے چند حصے اور چند گیت پیش کئے ان کے یہ گیت بڑے دلفریب اور معنی خیز تھے۔ اور ان میں تفریحی عنصر کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی جھلک رہا تھا۔ "ہم دل لگا کر پڑھتے ہیں تاکہ ہم بڑے ہو کر مزدور، کسان، سپاہی بن سکیں"! اور "صدر ماؤ پیکنگ میں رہتے ہیں، چلو گھوڑے پر سوار ہو کر پیکنگ چلیں"! ان بچوں کی مائیں ریشم کے کارخانے میں کام کرتی ہیں، جب تک وہ کارخانے میں رہتی ہیں۔ اس وقت تک بچے اس نرسریوں میں اپنی استانیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ پروگرام ختم کرنے کے بعد بچے دوڑتے ہوئے آئے اور ہماری گودوں میں بیٹھ گئے، یہ وہ بچے تھے جو بڑے ہو کر انجینیر

عوامی سپاہِ آزادی نے نعرہ لگایا ننھے دوستوں سے سیکھو



شیا چاؤ کیون کے سوئی تانگ اسکول کی ایک کلاس

یا پائلٹ نہیں بننا چاہتے تھے۔ بلکہ مزدور بننا چاہتے تھے۔ ہم ان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہ کون سے بچے ہیں جو افسر نہیں بلکہ مزدور بننا چاہتے ہیں۔ لیکن بھولے بھالے بچے ہمارے دل کی بات کیا سمجھ سکتے تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اس دنیا میں ایسے معاشرے بھی ہیں جہاں مزدور، کسان ہونا سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔

جب ہم باہر نکلے تو بچے بھی باہر نکل آئے اور انہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمیں رخصت کیا۔ "شو شو آئی سائے چین! شو شو، آئی سائے چین!! (چچا، خالہ الوداع! چچا خالہ الوداع!!) ہمیں دور تک ان کی آواز سنائی دیتی رہی ... شو شو آئی سائے چین!!

راستے میں ہمیں ان پودوں کے کھیت نظر آئے جن کے پتے ریشم کے کیڑوں کی غذا ہیں۔ ہم نے یہی سن رکھا تھا کہ ریشم کے کیڑے صرف شہتوت کے پتے کھاتے ہیں، لیکن ہمیں بتایا گیا کہ یہاں ریشم کے کیڑوں کو صرف یہی پتے دیئے جاتے ہیں۔ ہم نے وہ جگہ بھی دیکھی جہاں یہ کیڑے پالے جاتے ہیں۔ چند اندھیرے سے کمرے تھے جن میں تنکوں کے بنے ہوئے لمبے لمبے چھاج رکھے ہوئے تھے۔ اور ان میں لاکھوں چھوٹے چھوٹے کیڑے کلبلا رہے تھے۔ ان کے اوپر نیچے تو کچھ نہیں ہو رہی تھی۔ جب یہ کیڑے بڑے ہو جاتے ہیں، اور خول بنانے لگتے ہیں تو انہیں تنکوں کے بنے ہوئے پیچدار گولوں میں رکھ دیا جاتا ہے۔ جب ان کا خول مکمل ہو جاتا ہے تو انہیں جمع کر کے کارخانے لے جایا جاتا ہے جہاں انہیں گرم پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جس میں پڑتے ہی وہ مر جاتے ہیں۔ پھر خول سے سوت کا سرا نکال کر چکریوں میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ اور سارا سوت ان میں لپیٹ لیا جاتا ہے۔

یہاں گلیوں کا فرش بڑی بڑی سلوں اور چپٹے پتھروں سے بنا ہوا تھا۔ یہ سلیں مزار کے کتبوں کی طرح ہموار تھیں اور ان میں بعض پر چینی میں چند جملے بھی لکھے ہوئے تھے معلوم ہوا کہ یہ سلیں قدیم زمانے کے طالب علموں کی "اسناد" ہیں، فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہیں یہ سلیں پیش کی جاتی تھیں۔ یہ بھی بڑی ستم ظریفی ہے۔ کہ ان کی یہ اسناد ان کی زندگی میں ان کے کسی کام نہ آسکیں اب نئے چین کے نئے شہری اپنے قدموں سے ان پر نئے نقش ثبت کر رہے ہیں۔

سوئی تانگ اسکول کی عمارت بہت خوبصورت ہے۔ خالص چینی طرز تعمیر جھلکتا ہے۔ اسکول کے باہر ایک چھوٹا سا فارم ہے، جس میں یہاں کے طلباء گندم اگاتے ہیں۔ اس اسکول میں کل ۳۰۹ طالب علم پڑھتے ہیں۔ استادوں کی تعداد ۲۵ ہے۔ ۱۸ پرائمری کلاسیں ہیں اور دو مڈل، یہ اسکول آزادی سے پہلے قائم کیا گیا تھا۔ اس وقت اس کا انتظام زمیندار کیا کرتے تھے۔ اب اس کا نگران کسانوں کا نمائندہ "تنگ چھن لن" ہے یہاں کے دس استاد دوسرے شہروں سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں باقی پندرہ اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پرائمری کلاسوں میں دوسرے مضامین کے علاوہ سیاست، زراعت اور موسیقی کے مضامین بھی شامل ہیں۔ مڈل اسکول میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے۔ پرائمری اسکول کی سالانہ فیس ۶ یوان (۱۲ روپے) اور مڈل اسکول کی سالانہ فیس ۱۱ یوان ہے (جس میں طلباء کو کتابیں بھی فراہم کی جاتی ہیں) زراعت اور سیاست کی کلاس کسان لیتے ہیں یہاں نو افراد پر مشتمل ایک انقلابی کمیٹی قائم کی جا چکی ہے، جس میں کارکنوں، کسانوں اور استادوں کے نمائندے شامل ہیں اس سال چالیس طالب علموں کو ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ تاکہ وہ واپس آکر اس علاقے کے مختلف اسکولوں میں تدریس کے فرائض انجام دے سکیں

ہم بہت سی کلاسوں میں گئے۔ کمرے بہت روشن اور ہوادار تھے۔ ہر جگہ طالب علموں نے گرمجوشی سے تالیاں بجا کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ یہ ان کسانوں کے بچے تھے جو آزادی سے قبل اس بات کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔ کہ ایک دن ان کے گھروں میں بھی علم کی روشنی پھیلے گی۔ اور ان کے بچے اپنے ہاتھوں میں قلم پکڑ سکیں گے۔ ہم نے انگریزی کی کلاس بھی دیکھی جہاں بچے ٹیڑھے میڑھے حروف میں LONG LIVE CHAIRMAN MAO لکھ رہے تھے۔ اور اپنے استاد کے ساتھ چینی لہجے میں اسے بار بار دوہرا رہے تھے۔ میں نے اب تک چین میں جتنے بھی چھوٹے بڑے اسکول دیکھے ہیں، ان میں موسیقی کی کلاس ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ایک کلاس میں استانی چھوٹا سا پیانو بجا رہی تھی۔ اور طلباء اس کے ساتھ ساتھ گا رہے تھے۔ اسٹاف روم میں جب ہمارے امریکی ساتھی نے استادوں سے پوچھا کہ "انگریزی کیوں پڑھائی جاتی ہے" تو انہوں نے جواب دیا کہ "یہاں انقلاب کے لئے انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ انگریزی ایک اہم زبان ہے۔ تکنیکی علم کے لئے بھی اس زبان کو سمجھنا ضروری ہے۔" انہوں نے بتایا کہ "وہ امتحان کے طریقے پر تجربے کر رہے ہیں۔ کیونکہ پرانے زمانے کا طریقہ بے ڈھب ہے۔ اس سے طلباء کی ذہانت

الفتح

چین کا ہر بچہ بڑا ہو کر مزدور یا کسان بننا چاہتا ہے

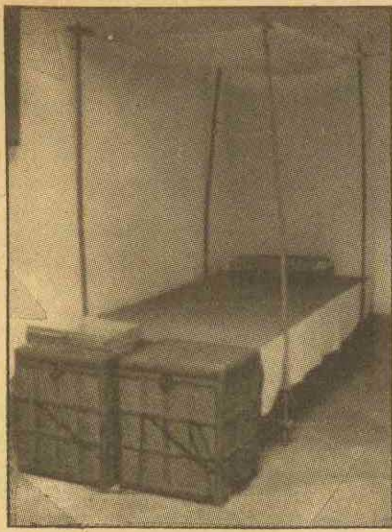
کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ اب یہاں ایک ایسا طریقہ بھی رائج کیا گیا ہے جس کے تحت طلباء کو کتابیں دے دی جاتی ہیں، اور وہ کتاب میں دیکھ کر سوالات کے جوابات دے سکتے ہیں، طالب علم کی سال بھر کی کارکردگی کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے، بہرحال وہ اپنے موجودہ طریقے سے اب بھی مطمئن نہیں ہیں۔ اور اس پر نئے تجربے کرنا چاہتے ہیں۔ باہر بہت سے طلباء اور طالبات ٹیبل ٹینس کھیل رہے تھے، بہت سی میزیں تھیں اگیمز ٹیچر ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسکول کی ٹیم منتخب کی جا رہی ہے۔ جو اس علاقے کے اسکولوں کے ٹورنامنٹ میں اپنے اسکول کی نمائندگی کرے گی۔ ہمیں آتا دیکھ کر انہوں نے اپنا کھیل روک دیا اور بڑی گرمجوشی سے تالیاں بجانے لگے۔

جب ہم بریگیڈ کے نمائندوں سے رخصت ہو رہے تھے تو انہوں نے بڑی انکساری سے کہا: "ہم ابھی بہت پیچھے ہیں۔ ہم میں بہت سی خامیاں ہیں، ہم ابھی اپنے بہت سے مسائل حل نہیں کر سکے، ہمیں ریاست کی ترقی اور انسانیت کی سربلندی کے لئے اور اہم کردار ادا کرنا چاہیئے تھا۔" اور جب ہماری کاریں ان کے لہلہاتے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہی تھیں تو میں اپنے ذہن میں دن بھر کے تاثرات یکجا کر رہا تھا۔ "اگر پیچھے ہونے پر یہ لوگ اتنے آگے ہیں تو آگے ہونے پر یہ کہاں ہوں گے!"

گوانچو الیکٹرک مشینری پلانٹ کوانچو میں اپنی نوعیت کی سب سے بڑی فیکٹری ہے اس فیکٹری کی انقلابی کمیٹی کا نائب صدر چین کوانگ فان ایک نوجوان مزدور ہے، یہ فیکٹری ۱۹۵۸ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس طرح اسے قائم ہوئے تیرہ سال ہو چکے ہیں۔ اس دوران یہ فیکٹری حیرت انگیز رفتار سے ترقی کرتی رہی ہے۔ ۶۹ء میں آزادی سے قبل کی بلند ترین سطح سے ساٹھ فیصد زیادہ مشینیں اور آلات بنائے گئے اور پچھلے سال ۱۹۶۹ء کے مقابلے میں ۷۴ فیصد اضافہ ہوا، اس دوران ان کے یہاں ۴۰ مصنوعات کا اضافہ ہو چکا ہے اور سو سے زائد تکنیکی اختراعات کی جا چکی ہیں۔ اس وقت اس فیکٹری میں پندرہ سو مزدور کام کرتے ہیں۔ یہاں کل چار ورکشاپ ہیں جہاں مختلف قسم کی مشینیں بنائی جاتی ہیں۔ لیکن ان کی اصل مصنوعات الیکٹرک موٹر اور جنریٹر ہیں۔ اس کے علاوہ وہ دوسروں کے پروجیکٹوں کی تکمیل کے لئے آرڈر پر مختلف قسم کے دوسرے آلات بھی بناتے ہیں۔ پچھلے سال انہوں نے صرف تین ماہ کے قلیل عرصہ میں خود اپنی کوششوں سے ایک بڑی خودکار مشین کا ڈیزائن بنایا ہے جسے کرسٹل سے کنٹرول کیا جاتا ہے اور اس میں دھات کی دس ملی میٹر سے بھی زیادہ موٹی پلیٹیں کاٹی جا سکتی ہیں اس مشین میں ایک پرانا جنریٹر استعمال کیا گیا ہے۔ جو انہوں نے ایک دوسرے کارخانے سے حاصل کیا ہے۔ جس نے اسے کنڈم قرار دے کر پھینک دیا تھا۔ اس مشین کی ڈیزائن سازی اور تیاری کے کام میں ایک مزدور نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، یہ مزدور صرف پرائمری اسکول تک پڑھا ہوا ہے عملی طور پر اسے دس سال کا تجربہ ہے، اسی تجربے کی بنیاد پر اس نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو آزمایا اور آخر اس تجربے میں کامیابی حاصل کر لی، وہ ہمیں بڑی تفصیل کے ساتھ اس مشین کے کل پرزوں کا نظام سمجھا رہا تھا۔ اور ہم آنکھیں پھاڑے ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھ رہے تھے یہ کوئی پہلی مثال نہیں ہے۔ چین کے کونے کونے میں ہر چھوٹے بڑے کارخانے میں مزدور نت نئے تجربے کر رہے ہیں، سیاسی اقتدار ان کے پاس ہے۔ معاشرے میں انہیں سب سے بلند مقام حاصل ہے حکومت ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس لئے وہ پوری خود اعتمادی اور یکسوئی کے ساتھ نت نئی مشینیں ایجاد کر رہے ہیں

کوانگچو الیکٹرک مشینری پلانٹ میں حیرت انگیز تجربے کئے جا رہے ہیں

نئی نئی اختراعات کر رہے ہیں، ٹیکنیشنوں اور انجینئروں کے بت، بڑے بت بیوشاوچی کے ساتھ ہی پاش پاش ہو کر بکھر گئے تھے۔ وہ باتیں زیادہ بناتے تھے۔ کام کم کرتے تھے۔ ان میں برتری کا منفی احساس موجود تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ نہیں ہوں گے تو کارخانے بند ہو جائیں گے، لیکن مزدوروں نے جنہیں شدت کے ساتھ اس بات کا احساس



کسان تحریک کے انسٹی ٹیوٹ میں صدر ماؤ کے کمرے کا ایک رخ

تھا کہ یہ معاشرہ ان کا اپنا معاشرہ ہے اور اس کی کامیابی ان کی اپنی کامیابی ہے، ان کی تمام خوش فہمیوں کے تانے بانے بکھیر دیئے۔

اس جذبے کی مثالیں قدم قدم پر بکھری ہوئی ہیں، کوانچو الیکٹرک مشینری پلانٹ نے بجلی پیدا کرنے کی جدید طرز کی ایک موٹر بنائی، اس موٹر میں سلکون اسٹیل پلیٹیں استعمال کی جاتی ہیں، جو چین میں نہیں بنائی جا سکتی تھیں، چنانچہ چین نے جاپان سے یہ پلیٹیں خریدنی چاہیں اتفاق سے روس کو بھی ان پلیٹوں کی ضرورت تھی۔ اس نے چین سے زیادہ قیمت لگادی۔ اور معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا، جب اس پلانٹ کے مزدوروں کو اطلاع ملی تو انہیں بہت غصہ آیا اور انہوں نے اعلان کیا کہ وہ خود پلیٹیں بنائیں گے، اور واقعی وہ ایک قلیل عرصہ میں اسی قسم کی پلیٹیں بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک ورکشاپ میں پہلے پنکھے بنائے جاتے تھے۔ لیکن اب یہاں انہیں پرانی مشینوں پر کرین موٹریں بنائی جا رہی ہیں۔

جب ہم مختلف ورکشاپوں کا چکر لگا رہے تھے۔ تو ہم نے بہت سے نوعمر لڑکوں کو مختلف مشینوں پر کام کرتے دیکھا، معلوم ہوا کہ یہ اسکولوں کے طالب علم ہیں۔ جو جسمانی محنت میں حصہ لینے آتے ہیں، سال بھر طلباء کے مختلف گروپ باری باری جسمانی محنت میں حصہ لینے آتے ہیں اور دو ہفتے سے لے کر ایک ماہ تک یہاں کام کرتے ہیں۔ اس وقت وہاں ۱۵۰ طلباء کا ایک گروپ کام کر رہا تھا۔ یہاں ان کی تکنیکی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور وہ مزدوروں سے سیاسی تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں انہیں مزدوروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے، وہ پرانے مزدوروں سے آزادی سے قبل کی

یہاں ذخیرہ اندوزی، منافع خوری اور چور بازاری کا نام تک نہیں ہے

تلخ داستانیں سنتے ہیں جس سے ان کا طبقاتی شعور اور پختہ ہو جاتا ہے۔ یہی مزدور ان کے آئیڈیل ہوتے ہیں۔ چین کا ہر بچہ بڑا ہو کر یا تو مزدور بننا چاہتا ہے، یا کسان یا سپاہی۔ میں نے خود کئی بچوں سے پوچھا ہے "بڑے ہو کر کیا بنو گے"؟ وہ بڑی سادگی سے، جوش سے کہتے ہیں، کون ژن! (مزدور) یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، ہمارے معاشرے کا ہر بچہ پائلٹ یا انجینئر بننا چاہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ان کی افادی اہمیت ہے۔ چین کا بچہ کونگ ژن یا چے فان چوینگ (سپاہی) اس لئے بننا چاہتا ہے کہ یہاں انہیں سب سے بلند مقام حاصل ہے۔ مزدور ہونا بڑے رتبے کی علامت ہے۔

اس فیکٹری کا ایک مزدور جس کی عمر تیس سال ہے پیکنگ کی چھینگ خوا یونیورسٹی میں اور دوسرا مزدور جس کی عمر بیس سال ہے۔ کوانچو کی سن یات سن یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ سن یات سن میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں بھی یہاں کے دو نوجوان مزدور تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ثقافتی انقلاب کے دوران اس فیکٹری کے مزدوروں نے تعلیمی اداروں میں اپنی پروپیگنڈہ ٹیم بھیج کر ماؤزے تنگ فکر کی ترویج اور اشاعت کا زبردست کام کیا ہے۔ انہوں نے سن یات سن یونیورسٹی میں بھی اپنی پروپیگنڈا ٹیم بھیجی تھی جس نے وہاں مہینوں سیاسی طور پر طالب علموں کی رہنمائی کا کام انجام دیا ہے

اس فیکٹری کی انقلابی کمیٹی ۱۰ مزدوروں اور ۷ ٹیکنیشنوں پر مشتمل ہے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں انقلابی کمیٹی کے صدر چھن کوانگ فان نے بتایا کہ ثقافتی انقلاب کے دوران ہمارے ملک کی طرح یہاں بھی طبقاتی کشمکش کی علامات سامنے آئی تھیں، مزدور مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ کیونکہ صورت حال بہت پیچیدہ تھی۔ لیکن کسی خاص فرد پر تنقید نہیں کی گئی۔ صرف لیو شاؤ چی کی مذموم راہ عمل پر تنقید کی گئی۔ اس مسئلے پر کسی کے ذہن میں شکوک نہیں تھے۔ کہ لیو شاؤ چی کی پالیسی مزدور دشمنی تھی۔ اس نے کہا کہ اب ہمارے مزدور اور ٹیکنیشین ایک ساتھ مشینوں پر کام کرتے ہیں۔ ٹیکنیشین دفتر میں نہیں بیٹھتے بلکہ ایک دوسرے سے سیکھنے کے جذبے کے تحت ورکشاپ کے اندر جا کر مزدوروں سے سیکھتے ہیں۔ یہاں سب سے زیادہ تنخواہ ۱۷۰ یوان ماہانہ (۳۴۲ روپے) اور سب سے کم تنخواہ ۳۹ یوان (۷۸ روپے) ماہانہ ہے۔ اس طرح تنخواہوں کا اوسط ساٹھ یوان ماہانہ ہے جو سرکاری شرح کے مطابق ۱۲۰ روپے ہے۔ چین کے مزدور اس رقم سے نہ صرف پورا مہینہ بڑی خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں بلکہ بینکوں میں بھی بڑی بڑی رقمیں پس انداز کرتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے برخلاف بیروزگاری کا لفظ یہاں کی لغت میں موجود نہیں ہے بچوں کے ماسوا، کنبے کا ہر فرد پیداواری محنت میں حصّہ لیتا ہے اس طرح ایک کنبے کی مجموعی آمدنی کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں اکثر صورتوں میں پورے گھرانے کا بار صرف ایک فرد کے کاندھوں پر ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ اشیاء کی قیمتوں میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ بنیادی ضروریات کی تمام اشیاء اناج، کپڑا، گوشت، سبزیاں بہت سستی ہیں، منافع خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی کا یہاں کوئی تصور نہیں ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کی فیسیں برائے نام ہیں (اکثر صورتوں میں فیس کی رقم سے کتابیں بھی فراہم کی جاتی ہیں) دوائیں بہت سستی ہیں، بسوں کے کرائے بہت کم ہیں

ہر گھرانے میں ایک بائیسکل موجود ہے ہمارے یہاں تجارت کا مقصد لوگوں کی جیبیں خالی کرانا ہوتا ہے۔ اس لئے قیمتوں کا رُخ آسمان کی طرف رہتا ہے لیکن یہاں قیمتیں ہمیشہ مستحکم رہتی ہیں، کیونکہ یہاں تجارت کا مقصد "عوام کی خدمت" ہے! اسی وجہ سے بعض لوگ اپنی تنخواہ سے خاصی رقم بچا لیتے ہیں اور پھر بعض بے غرض افراد ایسے بھی ہیں جو رضاکارانہ طور پر اپنی سال بھر کی بچت حکومت کو واپس کر دیتے ہیں۔ کہ اب اس کا مصرف کیا رہا۔

تعلیمی فیس برائے نام
دوائیں سستی
اور بسوں کے کرائے
بہت کم ہیں

اسی دن سہ پہر کو ہم نے کسان تحریک کا انسٹی ٹیوٹ دیکھا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ۱۹۲۶ء میں ماؤزے تنگ نے قائم کیا تھا۔ اسے چین کے انقلاب کی تاریخ میں زبردست اہمیت حاصل ہے کیونکہ کسان چین کے انقلاب کا محور رہے ہیں اور یہ انسٹی ٹیوٹ کسان تحریک کے کارکنوں کا تربیتی ادارہ رہا ہے، ماؤزے تنگ نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ انقلاب میں کسانوں کے کردار کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اس زمانے میں چین کی اسّی فیصد آبادی کسانوں پر مشتمل تھی۔ ان کی پہلی مشہور تصنیف جو ایک تحقیقاتی رپورٹ تھی۔ اور جو انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے پیش کی تھی، صوبہ ہونان کی کسان تحریک کے بارے میں تھی۔ یہ مضمون انہوں نے اس انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے چند ماہ بعد لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ

"ایک بہت ہی مختصر سے عرصہ میں چین کے مرکزی، جنوبی اور شمالی صوبوں میں کروڑوں کسان ایک طوفان کی مانند اُٹھ کھڑے ہوں گے یہ قوت اس قدر زبردست ہو گی کہ کوئی بھی طاقت خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو اسے روک نہ سکے گی۔ ..... وہ تمام سامراجیوں جنگی سرداروں، بداطوار افسروں، مقامی ظالموں اور رؤسا کو قبروں میں دفن کر دیں گے۔"

کسان تحریک کے کارکن یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد چین کے مختلف صوبوں میں جا کر کسان تحریکوں میں کام کرتے تھے۔ اور کسان تحریک کو مزدور تحریک کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ماؤزے تنگ کے بڑے بھائی ماؤزے من نے جو انقلاب کے پہلے شہیدوں میں سے ایک ہیں، یہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ وہ افراد تھے جنہوں نے انقلاب کے لئے اپنی زندگیاں تج دی تھیں، انہوں نے قریہ قریہ پھر کر کسانوں کو عوامی تحریک میں شامل ہونے پر ابھارا اور اپنی پارٹی کی پالیسی کو ان کے عمل میں بدل کر ایک ناقابل تسخیر قوت کو جنم دیا۔ ان کے پاس کوئی مادی قوت نہیں تھی لیکن وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ فیصلہ کن عنصر ہتھیار نہیں بلکہ انسان ہوتے ہیں؟ انہوں نے کسانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ انہیں یقیناً فتح حاصل ہو گی۔ اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ ماؤزے تنگ کی پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی، چین کے کسان اُٹھ کھڑے ہوئے اور اتنا زبردست طوفان آیا کہ دنیا بالکل الٹ پلٹ ہو گئی اور بڑے بڑے ظالم، بد دماغ زمیندار کسانوں کے قدموں میں آ رہے!

اس وقت اس انسٹی ٹیوٹ میں کل ۳۲۷ طلباء زیر تعلیم ہیں جو چین کے بیس صوبوں سے یہاں آئے ہیں۔ دو طالبات نے دفتر میں ہمیں اس تحریک کا پس منظر بتایا۔ انہوں نے بتایا

مزدوروں کے لئے یونیورسٹی کے دروازے کھول دیئے گئے



نوجوان چو این لائی اپنی فوجی وردی میں

کر ۱۹۵۳ء میں اس میں نئی ضروریات کے مطابق نئی تبدیلیاں کی گئی تھیں، کیونکہ اب ملک آزاد ہو چکا ہے اور اب کسان تحریک کا مقصد آزادی کا حصول نہیں رہا بلکہ سوشلسٹ معاشرے کا استحکام ہے، یہاں ایک کلاس روم میں ماؤزے تنگ بھی لیکچر دے چکے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں اس کے قریب ایک دوسری عمارت میں ایک نمائش گھر بھی قائم کیا گیا ہے۔

یہ انسٹی ٹیوٹ چینی طرز کی ایک بہت ہی خوبصورت عمارت میں ہے۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی ماؤزے تنگ کے ایک سفید مجسمے پر نظر پڑی۔ جو دالان میں گھنے درختوں کی چھاؤں میں کھڑا ہوا ہے۔ جا بجا رنگ برنگے پھولوں کے پودے لگے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر روایتی طرز کی محرابیں بنی ہوئی ہیں، پیچھے نمائش گھر کی بڑی سی عمارت کی ایک جھلک سی نظر آتی ہے جس کے اوپر سرخ رنگ کی بڑی بڑی مشعلیں جگمگا رہی ہیں، اس انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں ایک چھوٹا سا میوزیم بھی ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے طلباء کس طرح تعلیم حاصل کرتے تھے اور کیسی زندگی بسر کرتے تھے۔ سب سے پہلے ہمیں ایک چھوٹا سا کمرہ دکھایا گیا بائیں طرف کونے میں تختوں کی ایک بھدی سی چارپائی پڑی ہوئی ہے جس پر ایک سفید مچھر دانی لگی ہوئی ہے، دائیں طرف دیوار سے ذرا ہٹ کر ایک پرانی میز رکھی ہوئی ہے جس پر ایک قلمدان میں چند قلم رکھے ہوئے ہیں۔ ایک چائے دانی اور چند پیالے بھی ہیں۔ یہ کمرہ اس زمانے میں ماؤزے تنگ کا دفتر تھا۔ یہاں وہ آرام بھی کیا کرتے تھے۔ میز اصلی نہیں ہے لیکن چارپائی اصلی ہے۔ چارپائی کے سامنے دروازے کی طرف کاغذ کے دو بوسیدہ سے بکس پڑے ہوئے ہیں، جس میں وہ اپنے گھر سے کتابیں بھر کر لاتے تھے۔ اس دفتر میں بیٹھ کر انہوں نے بعض اہم تحریریں لکھی ہیں، یہاں وہ نہ صرف اس انسٹی ٹیوٹ کی نگرانی کرتے تھے۔ بلکہ ملک کے سیاسی حالات پر بھی نظر رکھتے تھے۔ دوسری طرف اسٹاف روم تھا جہاں اساتذہ اپنے خالی اوقات میں بیٹھا کرتے تھے۔ یہاں چند میزیں اور کرسیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ایک پرانے اخبار "مزدوروں کی راہ" کے چند شمارے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کمرے میں ایک پینٹنگ بھی ٹنگی ہوئی ہے جس میں ماؤزے تنگ، چو این لائی اور انسٹی ٹیوٹ کے ایک نامور استاد شیاؤ چھوبی کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں، وہی دونوں نوجوان طالبات جنہوں نے دفتر میں اپنے انسٹی ٹیوٹ کا تعارف کرایا تھا۔ یہاں بھی ہماری رہنمائی کر رہی تھیں۔

ایک کمرہ دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں پرانی طرز کا ایک ٹیلی فون بھی رکھا ہوا ہے۔ لائبریری میں بہت سی پرانی الماریاں اور میزیں پڑی ہوئی ہیں۔ جن پر اس زمانے کے بہت سے رسالے، اخبارات اور کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔ یہاں طلباء اپنے خالی اوقات میں مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ان ذہین طلباء نے صدیوں پرانے جاگیرداری نظام کے خلاف غریب کسانوں کو منظم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہم نے وہ کلاس روم بھی دیکھا جہاں ماؤزے تنگ طلباء کو لیکچر دے چکے ہیں، اس لیکچر کو سننے کے لئے بہت سے مزدور بھی یہاں آئے تھے اس موقع کی ایک پینٹنگ بھی لگی ہوئی ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ طلبا اور مزدور بڑی محویت کے عالم میں اپنے محبوب لیڈر کا لیکچر سن رہے ہیں۔

ہم نے وہ کمرے بھی دیکھے جہاں طلبا سوتے تھے کم چوڑائی والے لمبے لمبے سے کمرے ہیں اور ان میں اوپر نیچے دو منزلہ بستر بچھے ہوئے ہیں بالکل اسی طرح جیسے فوجیوں کے لئے ہوتے ہیں۔ ہر طالب علم کے پاس ایک تام چینی کا مگ، ٹوتھ برش اور گھاس کی بنی ہوئی ایک چپل ہوتی تھی اس کے پاس ایک فوجی وردی اور فوجی طرز کا ایک چھوٹا سا خاکی بیگ بھی ہوتا تھا جس میں وہ اپنی ضروریات کی چیزیں رکھتا تھا۔ بس یہی تھی اس کی کل کائنات۔ جب وہ یہاں آتا تھا۔ تو اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کتنی سخت زندگی بسر کرنے جا رہا ہے۔ پھر یہ طالب علم کوئی معمولی شخص نہیں ہوتا تھا۔ یہ چین کے جبیں صوبوں کے سب سے حساس اور سب سے دردمند لوگوں میں سے ہوتا تھا اسے اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ چین کے غریب کسان کتنی پُرآرام زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ اپنے معاشرے کو بدلنے کے لئے بڑی سی بڑی قربانیاں دینے کو تیار رہتا تھا اور اسے اس بات کا پورا احساس ہوتا تھا کہ "انقلاب کوئی ٹی پارٹی نہیں ہے!"

کھانے کا ہال سادہ سا تھا۔ وہاں بہت ساری پرانی میزیں اور بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہر طالب علم اپنا کھانا خود کچن سے لاتا تھا۔ بیچ میں ایک بڑے سے برتن میں چاول رکھا ہوتا تھا جس میں سے وہ حسب ضرورت چاول نکال کر اپنی پلیٹ میں ڈال لیتا ہے، اس انسٹی ٹیوٹ میں بہت سے طلباء ایسے بھی تھے جو ہوئی قومیت سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمان تھے ماؤزے تنگ نے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ تمام طلبا کو ان کے رسوم و رواج کے مطابق کھانا دیا جائے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ مسلمانوں کی پلیٹ میں سور کا گوشت نہ ہو۔ ماؤزے تنگ خود بھی یہاں طلبا کے ساتھ کھانا کھا چکے ہیں۔ اس موقع کی عکاسی کے لئے ایک پینٹنگ بھی لگی ہے جس میں وہ ہوئی قومیت کے ایک مسلمان طالب علم سے ڈائننگ ہال کے بارے میں اس کی رائے معلوم کر رہے ہیں۔

فوجی انسٹرکٹر کا کمرہ الگ تھا۔ یہاں میزوں کے علاوہ دو چار پائیاں بھی پڑی ہوئی ہیں، ماؤزے تنگ اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ اور فوجی انسٹرکٹر کو ہدایات دیتے تھے۔ کہ طلبا کو تربیت دیتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے چو این لائی بھی جو اس وقت فوج میں تھے۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں آکر فوجی تحریک اور کسان تحریک کے بارے میں لیکچر دے چکے ہیں۔ یہاں ان کی نوجوانی کی ایک تصویر لگی ہوئی ہے جس میں وہ فوجی وردی پہنے ہوئے ہیں، ان کی یہ تصویر ان کے موجودہ نقوش سے اتنی مختلف ہے کہ ہیں تو میں بہت سے چینی ساتھی بھی اسے نہ پہچان پاتے۔

اس انسٹی ٹیوٹ کے ایک سرگرم استاد شیاؤ چھوبی جو ایک پرانے کمیونسٹ تھے۔ اس کی نگرانی کے فرائض انجام دیتے تھے، ۱۹۲۷ء میں ہی کومنتانگ نے انہیں قتل کرا دیا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے طلباء جن میں ماؤزے تنگ کے بڑے بھائی ماؤزے من، چو چی لائے، جائی شے من اور کھانگ فوچینگ جیسے سرگرم کارکن شامل تھے۔ بعد میں کومنتانگ کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

ان شہیدوں نے اپنے لہو سے جو راہ روشن کی تھی۔ اسی پر چل کر چین کے کسانوں نے اپنے لئے آزادی حاصل کی تھی اور بدی اور نیکی کی ازلی و ابدی جنگ میں تاریخ کی عظیم ترین فتح حاصل کی تھی۔



قومی ہاکی ٹیم کے کھلاڑیوں کے انتخاب میں پرانی دوستی کام آگئی

لطافت علی صدیقی

پاکستان ہاکی کے میدان میں بے تاج بادشاہ ہے، لیکن اس کی یہ بالادستی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ہاکی کے باسوں نے غیر ملکی دورے پر جانے والی سولہ ممبروں پر مشتمل جو ٹیم ترتیب دی ہے۔ وہ باہر جانے والی بیشتر ٹیموں میں سب سے کمزور نظر آتی ہے۔ یہ ٹیم بارسلونا (اسپین) میں ۱۵۔اکتوبر سے شروع ہونے والے "ورلڈ ہاکی ٹورنامنٹ" میں شرکت کرے گی۔ اس مقابلے میں بھارت، مغربی جرمنی، ہالینڈ اور آسٹریلیا کی بہترین ٹیمیں حصہ لیں گی۔ زبردست مقابلے کا امکان ہے۔

پاکستان کی ٹیم ابھی حال ہی میں بین الاقوامی اور ایشیائی چیمپئن کا اعزاز حاصل کر چکی ہے ایسے موقع پر جب کہ مقابلے میں طاقتور ٹیموں کا سامنا ہے اور ساتھ ہی سابقہ اعزاز کو بھی برقرار رکھنا ہے۔ پاکستانی کھلاڑیوں کے انتخاب میں حد درجہ غیر جانبداری برتنا چاہیئے تھی نیز کھلاڑیوں کے انتخاب میں صرف ان کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھنا چاہیئے تھا۔

لیکن ٹیم کے اعلان سے ہاکی کا حلقہ خاصہ متعجب ہوا اس بار رائٹ ہاف کے لئے ایک نو عمر کھلاڑی اختر رسول کا انتخاب کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ نو عمر کھلاڑی اچھی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ میں اس بات سے پورا اتفاق کرتا ہوں لیکن قومی ٹیم میں اسے ایسے وقت میں شامل کیا گیا جبکہ مقابلہ آسٹریلیا، مغربی جرمنی اور بھارت جیسی طاقتور ٹیموں کے درمیان ہوگا۔ نو عمر کھلاڑی کا انتخاب قبل از وقت کہا جا سکتا ہے۔

اختر رسول پاکستانی ٹیم کے ایک سابق نائب کپتان غلام رسول کا لڑکا ہے۔ یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ کیمپ کے سربراہ اور پاکستان ہاکی ٹیم کے نامزد مینیجر غلام رسول کے دوست ہیں کہا جاتا ہے دوستی کا یہی رشتہ نو عمر کھلاڑی اختر رسول کی قومی ٹیم میں شمولیت کا سبب بنا۔ قومی ٹیموں میں کھلاڑیوں کے انتخاب کے دوران ایسے رشتے ناطے، خوب چلتے ہیں اور بعض ایسے کھلاڑیوں کا نام جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، معجزے کی صورت میں ظاہر ہو کر اسپورٹس حلقے کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اس قسم کے المناک حادثوں کی وجہ سے جہاں ایک طرف قومی ٹیم کے وقار کو دھچکا لگایا جاتا ہے تو دوسری طرف نو عمر کھلاڑیوں کو وقت سے پہلے اس منصب تک پہنچا کر انہیں ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی کئی مثالیں ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ ۶۹۔۱۹۶۸ء میں ڈھاکہ میں نیوزی لینڈ کے مقابلے میں کھیلنے والی قومی کرکٹ ٹیم میں ۱۸ سالہ کھلاڑی آفتاب بلوچ کو شامل کیا گیا۔ ٹسٹ کے خاتمے کے ساتھ ہی نوجوان کھلاڑی کا نام بھی کرکٹ تاریخ سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔

اب ہمیں ہاکی ٹیم میں شامل کھلاڑیوں کا ایک سرسری جائزہ لینا چاہیئے جو اسپین میں دنیا کی بہترین اور طاقتور ٹیموں سے کھیلنے جا رہے ہیں۔

گول کیپر: شیروانی نے بنکاک کے پچھلے ایشیائی کھیلوں میں زبردست کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اپنی سابقہ پوزیشن میں کھیلے گا۔ پرویز کو اضافی گول کیپر کی حیثیت سے رکھا گیا ہے اس نے بھی اسی حیثیت میں بنکاک کا دورہ کیا تھا۔

فل بیک:۔ اس بار فل بیک کا انتخاب سب سے نازک رہا ہے۔ تنویر ڈار اور ریاض الدین کی جوڑی ختم ہو گئی۔ ریاض الدین کو ہٹا کر اس کی جگہ اختر الاسلام کو شامل کر لیا گیا ہے۔ جبکہ امنور کو ریزرو میں رکھا گیا ہے

بنکاک کے ایشیائی کھیلوں میں ریاض الدین نے خاص طور پر فائنل میں بھارت کے مقابلے میں زبردست کھیل پیش کیا تھا۔ اس مقابلے میں سنٹر فارورڈ رشید نے ایک گول بنا کر پاکستانی ٹیم کو ایشیائی ٹائٹل حاصل کرنے میں کامیاب بنا دیا تھا۔ ٹی وی میں ہم نے دیکھا تھا کہ ریاض الدین دفاعی لائنوں میں بھارت کے فارورڈ کھلاڑیوں کو کمال ہوشیاری اور ذہانت سے کھلا رہا تھا۔ اس بین الاقوامی کھیل میں اس کی عدم موجودگی محسوس کی جائے گی۔

قومی ٹیم سے اس کھلاڑی کا اخراج، قومی مفاد کے خلاف جائے گا۔ چند ماہ بیشتر قومی ٹیم کے کھلاڑیوں کو ایبٹ آباد میں تربیت کے لئے بلایا گیا تھا۔ ریاض الدین اپنی بیماری کی وجہ سے رپورٹ نہ کر سکا۔ اس نے بعد میں پاکستان ہاکی فیڈریشن کی ورکنگ کمیٹی کو میڈیکل سرٹیفکیٹ روانہ کر دیا۔ پاکستان پریس میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق پاکستان ہاکی فیڈریشن کی ورکنگ کمیٹی نے میڈیکل سرٹیفکیٹ پر غور و خوض کرنے کے بعد ریاض الدین کو ٹیم سے خارج کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح پاکستانی ٹیم ایک ایسے کھلاڑی سے محروم ہو گئی جو اب تک اولمپک کے علاوہ بے شمار بین الاقوامی مقابلوں میں پاکستان کی نمائندگی کر چکا ہے۔

ہاف لائن: لفٹ ہاف گلریز کی ریٹائرمنٹ اور رائٹ ہاف سعید انور کی طویل بیماری کی وجہ سے ہماری ٹیم کی ہاف لائن کمزور پڑ گئی ہے۔ گلریز اور سعید انور دونوں نے ۱۹۶۸ء میں میکسیکو اور ۱۹۷۰ء میں بنکاک میں بین الاقوامی اور ایشیائی ٹائٹل حاصل کرنے میں زبردست مدد دی تھی۔ اگر ۱۵۔اکتوبر سے پہلے سعید انور تندرست ہو گیا تو وہ کھیل میں شرکت کریگا سعید انور کے بائیں پیر کے گھٹنے میں درد رہتا ہے۔ حال ہی میں اس کے گھٹنے کا اپریشن بھی ہوا تھا۔ فضل الرحمٰن گلریز کی جگہ کھیلے گا۔ اگر سعید انور اپنی بیماری کے سبب کھیل میں شرکت نہ کر سکا تو پھر متنازعہ اختر رسول انور کی جگہ کھیلے گا۔

فضل الرحمٰن ایک تجربہ کار کھلاڑی ہے۔ لیکن وہ ناہموار اور کھردرے کھیل کا مظاہرہ کرتا ہے اس کے اس انداز کے کھیل کے سبب پنالٹیز کا خوف ہمیشہ دامنگیر رہتا ہے جہاں تک اختر رسول کا تعلق ہے، اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ کسی بھارتی

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں



سمیع سکّہ رائج الوقت تھے

لیکن سکّوں سے نفرت کرتے تھے

۳ اکتوبر کو برصغیر پاک و ہند کے عظیم فن کار، کارٹونسٹ سمیع کی برسی منائی جائے گی۔ اس روز سمیع کو لوگ خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔ ان میں یقیناً وہ ادارے اور شخصیات شامل نہیں ہوں گے جو ایسے مواقع پر بھی اپنا نفع نقصان دیکھتے ہیں اور جنھیں عظمت کا معیار سرکارِ والا تبار مقرر کر کے دیتی ہے۔ سمیع اپنی زندگی میں اُن کے محتاج نہیں رہے اور نہ ہی مرنے کے بعد یہ ادارے اور شخصیات اُنھیں کچھ دے سکتے ہیں۔ سمیع کو اُن کے فن نے عظیم بنایا۔ اور یہی فن اُن کی عظمت کی نشاندہی کرتا رہے گا۔

سمیع کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ انھوں نے برطانوی سامراج کے خلاف لڑنے والے ہراول دستے کے حریت پسند مولانا محمّد علی جوہر کے ساتھ کام کیا۔ "کامریڈ" کے صفحات آج بھی اس امر کے گواہ ہیں کہ سمیع بھی اس حریت پسند دستے کا ایک اہم کارکن تھا۔ جو اپنے قلم کے نشتروں سے برطانوی سامراج پر حملہ آور ہوتا تو چھکّے چھڑا دیتا۔ وہ اپنے قارئین کو ایک نیا عزم اور ولولہ دیتا۔

سمیع عوام کی آواز تھے۔ ایک دانشور کی حیثیت سے انھوں نے اپنی ذمہ داریاں باحسن طور پر انجام دیں عوام کو اندرونی اور بیرونی دُشمنوں سے خبردار کیا۔ وہ لوگ جو رہنما بنے ہوئے تھے۔ اُن کی شخصیت کے اسیر نہ ہوتے بلکہ جس کسی نے بھی عوام دُشمنی سے کام لیا۔ اس کو بے نقاب کرتے رہے۔

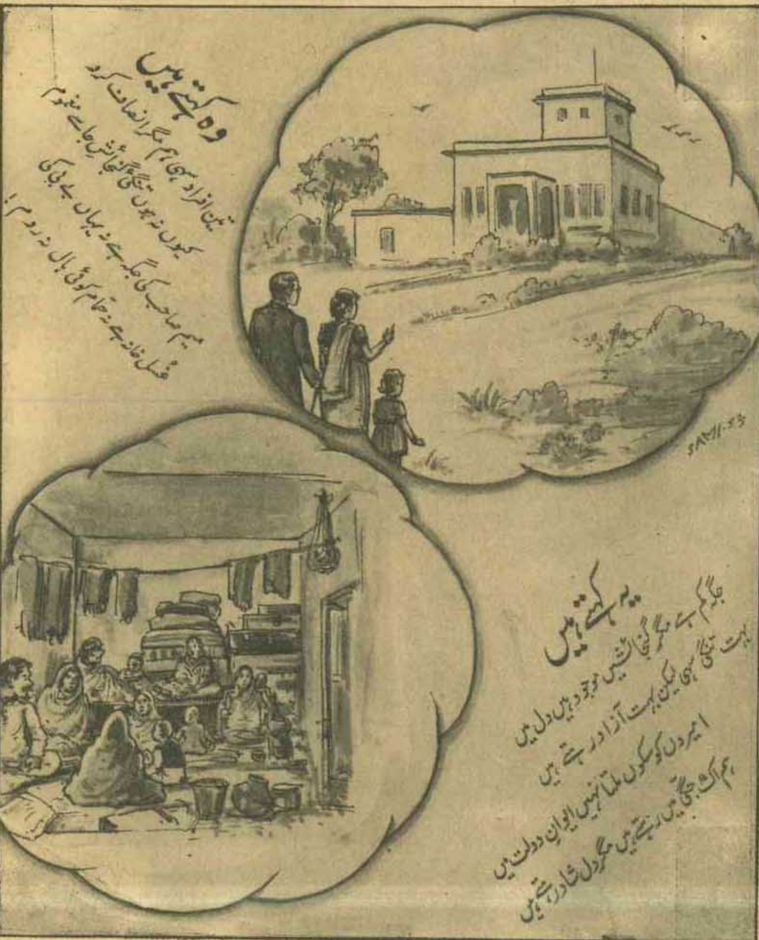
ایک طرف یہ عالم تھا اور دوسری طرف اُن کی

باقی صفحہ ۳۶ پر ملاحظہ فرمائیں

حریت پسند دستے کے ایک فنکار کی یادیں



تحریک۔ مذہبی ہو کہ سوشل خدا گواہ
قائد مزے میں رہتا ہے پبلک ہراس میں
لیڈر میں اور قوم میں یہ فرق ہے ضرور
ہم لاٹھیوں کی زد میں ہیں وہ اے کلاس میں



سمیع کے یادگار کارٹون، جو اُن کے فن کو زندہ رکھیں گے





یہ اعتراف ہے گناہ نہیں

میں بھی اس کے بچھائے ہوئے جال سے نہ بچ سکا

ممتاز فلم ساز و ہدایتکار ضیاء سرحدی نے الفتح کے لئے لکھا

سروج سے معاہدہ کر لینے کے بعد اب میں نے باقاعدگی سے وہاں پر آنا جانا شروع کر دیا۔ نانو بھائی ڈیسائی سے کہانی کی مجلسیں شروع ہوئیں، اور مل کر ہم غور کرنے لگے کہ میں ان کے کس مضمون کی کہانی لکھوں، انہیں ایام میں میری سمجھ میں یہ بات بھی آنے لگی تھی کہ فلم ایک SOCIAL PHENOMENA ہے، اس کا بھی زندگی اور انسان کی ہست و بود سے گہرا تعلق ہے اس لئے، اب مجھ کو ایسی کہانیاں لکھنی چاہئیں جو ایسی فکر کے ترازو میں مناسب طور پر تل سکیں اور ہلکی نہ معلوم ہوں۔ عمر کے اعتبار سے میں ہنوز تجرباتی دور میں تھا۔ میرے لئے یہی ممکن تھا کہ میں اب تک کی دیکھی، سنی اور سمجھی ہوئی باتوں سے ہی، اپنی نئی کہانیوں کے مضامین تلاش کروں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ببّو کی زندگی کے حالات اور واقعات کہانی کا روپ دھار کے بار بار میرے سامنے آتے چلے جا رہے تھے، ببّو دلّی کی ایک مشہور اور مقبول طوائف تھی اور خاندانی طور پر، یا یوں کہیے کہ معاشرے نے ان کو ایسے ہی کاموں پر متعین کر دیا تھا۔ کہ وہ اپنی گلوکاری اور عشوہ غمزہ سے لوگوں کے دل موہ لے، اور اس طرح سے اپنی گرفت کو مضبوط کر کے وہ لوگوں کی جیبوں سے دولت نچوڑ لے لیکن ببّو اپنے اس پیشہ کے باوجود بہت غیر طوائف قسم کی انسان تھی، جہاں وہ دولت لوٹنا جانتی تھی، اس کے ساتھ ساتھ وہ دولت کو لٹانا بھی پورے طور پر عمل میں لاتی تھی! ببّو کی اس صورت حال سے بہت سے لوگ بخوبی آشنا تھے اور دولت کے کچھ "گدھ" ہمیشہ اس کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے اور ان ایام میں میں نے نوٹ کیا تھا کہ کچھ ایسے مرد پیشہ ور رنڈیاں بن کر اس کے در پر پڑے رہتے تھے۔ اور ببّو کا مال خوب کھاتے تھے، ببّو جنس کے اعتبار سے بڑی تشنہ رہتی تھی اور جہاں اسے کوئی اچھی صورت نظر آتی، وہ دل کھول کر اس کو اپنا جسم اور اپنی دولت دے دیا کرتی، اس کے پیش نظر کئی لوگوں نے ہمیشہ ببّو کو بھرپور طریق سے EXPLOIT کیا تھا اور اب بھی ایک خلیل نامی حضرت اس کے ساتھ چپکے ہوئے تھے یہ خلیل صاحب شاید دوسرے خود فروش مردوں سے زیادہ چالاک تھے۔ اسی لئے اپنی گرفت کو مضبوط تر کر لینے کے خیال سے انہوں نے ببّو سے شادی بھی کر لی تھی۔ اب یہ تھا کہ ببّو جو کچھ کماتی اور صرف فلموں کے ذریعہ ہی سے نہیں بلکہ ان نوابوں اور مہاراجگان سے بھی، جو اس کے عشاق کی فہرست میں تھے، خلیل صاحب کے قدموں پر لا کر ڈال دیتی، گھر میں خلیل صاحب کا رول بڑا عجیب و غریب تھا۔ ایک طرف تو وہ ببّو کے شوہر محترم تھے مگر ساتھ ساتھ وہ گھر پر آنے جانے والے نوابین اور مہاراجگان کے ENTERTAINER بھی تھے، مجھ کو خلیل صاحب کا یہ دوہرا رول بہت ہی غور طلب محسوس ہوتا تھا۔ اور میں خلیل صاحب کو دولت پرست اور دولت پسند بورژوا معاشرے کا ایک مکروہ مگر قابل تحریر کردار سمجھنے لگا تھا۔ نانو بھائی کو چنانچہ میں نے یہ مشورہ دیا کہ خلیل کو بنیادی کردار بنا کر ایک کہانی تحریر کرنی چاہیئے۔ مگر باوجودیکہ نانو بھائی ایک گریجویٹ تھے اور ان کو سیریس کتابوں کے مطالعہ کا بھی شوق تھا ان کو میرا یہ مشورہ پسند نہ آیا اور انہوں نے مجھے عام قسم کی کوئی عشقیہ کہانی لکھنے کے لئے کہا۔ معاہدہ کی رو سے میں پابند تھا چنانچہ میں نے اس طرح کے مضمون کی تلاش شروع کر دی، سروج مووی ٹون میں ان دنوں خورشید زیب النساء اور جے راج وغیرہ، کام کیا کرتے تھے مگر اب تک ان تمام لوگوں سے میری بہت ہی رسمی اور سطحی ملاقات تھی۔

نانو بھائی کے دفتر میں ایک دن اُسی زمانے میں ایک نیا واقعہ ظہور پذیر ہوا، میں کہانی کے بارے میں نانو بھائی سے گفتگو کر رہا تھا۔ کہ زیب النساء بھی وہاں پر آ گئیں اور گفتگو میں شریک ہو گئیں۔ زیب النساء اُس زمانے میں انڈین سکرین کی SEDUCER مشہور تھی، اور پردہ سیمیں سے الگ بھی اپنی پسند کے مردوں کو گرفتار کرنا اس کا ایک نارمل مشغلہ تھا۔ زیب النساء کی سبز آنکھوں میں ہر وقت ایک خاص قسم کی "بے تابی" اور "آمادگی" رہتی تھی۔ چنانچہ اس ساحرہ کے بچھائے ہوئے جال سے میں بھی نہ بچ سکا۔ اور چند ہی روز میں میں بھی اس کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ زیب النساء نے اسٹوڈیو کی علیحدگیوں میں موقعہ نکال نکال کے مجھ سے ملنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح سے میرا اور اس کا ایک دیوانہ وار سلسلہ عشق شروع ہو گیا۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: سمیع آرٹسٹ

مقبولیت۔ اخباری صنعت والوں نے اُنھیں سکّہ رائج الوقت سمجھ لیا تھا۔ سمیع صاحب اپنی حیثیت سے بے خبر نہ تھے۔ اس صورت میں بھی انہوں نے عوام کا ساتھ دیا۔ اور زر کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

اس سماج نے اپنے روایتی اور تاریخی کردار کے پیشِ نظر سمیع سے انصاف نہیں کیا۔ عوام دوست طاقتوں کو اس سے انصاف کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ سمیع وفات پا چکے ہیں لیکن اُن کا فن زندہ ہے

الفتح



ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان کے چیئرمین مسٹر مطیع الرحمن نے اپنے حالیہ دورۂ عراق بغداد میں عراقی گرین بورڈ کو تیس ہزار ٹن باسمتی چاول مہیا کرنے کے ایک معاہدے پر دستخط کئے۔ تصویر میں دائیں سے دوسرے عراقی گرین بورڈ کے مسٹر مہدی الامار اور تیسرے مسٹر مطیع الرحمن ہیں۔

مطیع الرحمن کے آتے ہی

جماعتیے صنعتکاروں پر بجلی گر پڑی

عبدالحمید چھاپرا

گذشتہ ہفتے ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان کے چیئرمین مسٹر مطیع الرحمن پانچ ممالک کے اٹھارہ روزہ دورے کے بعد کراچی واپس پہنچ گئے، ان کی کراچی میں آمد سے نجی شعبے کے ان تاجروں اور صنعت کاروں پر گویا بجلی گری جو ان کی غیر حاضری میں طرح طرح کی افواہیں پھیلانے میں مصروف تھے۔

دورے سے واپسی پر ۲۲ ستمبر کو مسٹر مطیع الرحمن نے بیچ لگژری میں مقامی صحافیوں کے اعزاز میں ایک ظہرانہ دیا اس تقریب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مس گلزار بانو مسٹر عالم اور دونوں انصاریوں سمیت ٹریڈنگ کارپوریشن کے تمام سینیئر افسران شامل تھے۔

مسٹر مطیع الرحمن نے اپنے دورہ عراق میں تیس ہزار ٹن باسمتی چاول کی برآمدات کے لئے عراق کے سرکاری تجارتی ادارے سے معاہدہ کیا۔

یوگوسلاویہ میں ہونے والے زگریب بین الاقوامی میلے میں پاکستانی اسٹال کے افتتاحی تقریب کے موقع پر مسٹر مطیع الرحمن نے یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو اور مادام ٹیٹو کا استقبال کیا۔

ٹریڈنگ کارپوریشن کے قیام کے بعد بیرونی ممالک میں اور خاص طور سے سوشلسٹ ملکوں میں پاکستان کی ساکھ پر اچھا اثر پڑا ہے اگرچہ نجی شعبے کے بعض تاجروں کو کارپوریشن کا قیام انتہائی ناگوار گزرا ہے اور وہ کارپوریشن کا امیج خراب کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

پولینڈ میں قیام کے دوران مسٹر مطیع الرحمن نے وہاں کی تجارتی کارپوریشن اور سرکاری افسران سے دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کے فروغ کے لئے مذاکرات کئے مسٹر مطیع الرحمن نے نجی شعبے کے تاجروں اور پولینڈ کے درمیان جوتوں کی برآمدات کے مسئلے میں ہونے والے معاہدے اور پولینڈ کی ضروریات کے مطابق پاکستان میں تیار ہونے والے جوتوں کی پولینڈ میں جلد از جلد درآمدات کے بارے میں بھی بات چیت کی۔

پولینڈ نے درمیانی کوالٹی کے پاکستانی چاولوں کی خریداری میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے کارپوریشن نے پولینڈ او بعض دوسرے سوشلسٹ ملکوں کو درمیانی کوالٹی کے چاولوں کے نمونہ جات روانہ کئے ہیں۔ نیز مذاکرات جاری ہیں۔

مسٹر مطیع الرحمن نے بتایا کہ توقع ہے کہ کارپوریشن موجودہ مالی سال کے دوران بیس کروڑ روپے کی مالیت کے دو لاکھ ٹن سے زائد باسمتی چاول برآمد کرے گی۔ اس میں سے ایک لاکھ دس ہزار ٹن کویتی فرم کو، تیس ہزار ٹن عراق کو، دس ہزار ٹن سعودی عرب اور دس ہزار ٹن شارجاعہ کو فروخت کئے جا چکے ہیں۔ نیز عراق نے مزید بیس ہزار ٹن باسمتی چاول خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ تبادلۂ اشیاء کے معاہدوں کے تحت کارپوریشن کو بیس ہزار ٹن چاول سوشلسٹ ملکوں کو برآمد کرتے ہیں۔

مسٹر مطیع الرحمن نے انکشاف کیا کہ ان کے دورۂ سوئٹزرلینڈ میں وہاں کے تاجروں نے پاکستانی قالین اور نوادرات میں کافی دلچسپی ظاہر کی ان تاجروں نے کارپوریشن کے چیئرمین سے شکایت کی کہ پاکستانی تاجر سوئٹزرلینڈ کو برآمدات میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ مسٹر مطیع الرحمن نے مغربی جرمنی میں مختصر قیام کے دوران ٹریڈنگ کارپوریشن کے مقامی دفتر کی کارکردگی کا جائزہ لیا اور کارپوریشن کے مقامی افسران کو ہدایت کی کہ وہ پاکستان اور مغربی جرمنی کے درمیان تجارت کو فروغ دینے کے لئے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں۔

کارپوریشن کے جواں سال سینیئر ایگزیکٹو پبلک ریلیشنز منیجر مسٹر زاہد ملک جن کی تصنیف شدہ کتاب "تعلقات عامہ" عنقریب شائع ہونے والی ہے، پوری تقریب میں صحافیوں کی مہمان نوازی میں مصروف ہے۔

الفتح
کراچی

جماعتِ اسلامی نے مسلح تنظیم "البدر" قائم کر دی

نمائندہ خصوصی - ڈھاکہ

مشرقی پاکستان میں حکومت نے رضاکار فورس منظم کی اور اس کے لئے مختلف شعبۂ زندگی کے لوگوں سے تعاون و اشتراک حاصل کرنے کی کوشش کی تو جماعت اسلامی نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنے جماعتی کے کارکنوں کو بڑی تعداد میں رضاکار فورس میں داخل کر دیا اور ملک دشمنوں کے خلاف کارروائی کی آڑ میں اس نے ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی سیاسی اور جماعتی پوزیشن مضبوط کرنے کی کوشش کی اور اپنے سیاسی مخالفین کا قتل عام شروع کر دیا۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس وقت مشرقی پاکستان میں "بنگلہ دیش" کے نام سے علیحدگی پسندی کی جو تحریک چل رہی ہے وہ عوامی لیگ کی قیادت میں چل رہی ہے اور نام نہاد "مکتی باہنی" (سپاہ آزادی) بھی عوامی لیگ کی قیادت میں تخریبی کارروائی کر رہی ہے اس لئے۔ رضاکار فورس کے جوان ان کے خلاف مہم یا مسلح جھڑپ کے دوران انہیں موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں لیکن جماعت کے کارکنان جس طرح صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سیاسی مخالفوں کو قتل کر رہے ہیں وہ انتہائی قابل مذمت ہے جو لوگ مشرقی پاکستان کی حقیقی صورت حال سے واقف نہیں ہیں ان کے لئے یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ مشرقی پاکستان کے دیہاتوں میں مسلح باغیوں کے خلاف کارروائی کے ابتدائی ایام میں کسی شخص کو عوامی لیگی یا وطن دشمن کہہ کر ہلاک کر دینا کتنا آسان تھا یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بہت سے لوگوں نے ذاتی دشمنی کی عداوت اور عناد کی بنا پر بے شمار لوگوں کو وطن دشمن کہہ کر ہلاک دیا اور کسی کو اصل حقیقت کی کانوں کان اطلاع نہیں ملی۔ ایسے نازک حالات میں جماعت اسلامی کے کارکنوں نے رضاکار فورس میں شامل ہو کر اگر ایک جانب عوامی لیگیوں اور بھارتی ایجنٹوں کو ختم کیا تو دوسری جانب روپوش کمیونسٹوں نے بھاشانی اور ولی خاں نیپ کے کارکنوں حتیٰ کہ کونسل قیوم اور کنونشن مسلم لیگ اور پاکستان جمہوری پارٹی کے ممبروں اور کارکنوں کو بھی بے دریغ قتل کیا اور انہوں نے اپنے سیاسی حریفوں کو صاف کرنے میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہیں لیا۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ کونسل اور کنونشن مسلم لیگ سے لے کر پاکستان جمہوری پارٹی کے عہدہ داروں نے شکایت کی کہ جماعت کے کارکنان ان کے ورکروں کو قتل کر رہے ہیں لیکن کونسل مسلم لیگ اور پاکستان جمہوری پارٹی کے لیڈروں میں اتنی اخلاقی جرات نہیں ہوتی کہ وہ بر سر عام اس کا تذکرہ کرتے۔ یہ ممتاز سیاسی لیڈران پریس کانفرنسوں اور اخبار نویسوں سے گفتگو کے دوران "آف دی ریکارڈ" کے طور پر تو ان تمام سنسنی خیز باتوں کا انکشاف کرتے رہے لیکن ان میں "آن دی ریکارڈ" یہ تمام باتیں کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ وہ جب مشرقی پاکستان واپس جائیں گے تو انہیں جماعت اسلامی کی جانب سے شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سلسلہ میں اگر کسی سیاسی لیڈر نے زبان کھولی تو وہ ذوالفقار علی بھٹو تھے انہوں نے کسی لگی لپٹی کے بغیر بانگِ دہل کہا کہ جماعت اسلامی کے کارکن وطن دشمنوں کے نام پر اپنے سیاسی حریفوں کا قتل عام کر رہے ہیں اس لئے یہ قتل عام بند ہونا چاہیئے۔

مسٹر بھٹو کا مذکورہ بیان ایک زبردست دھماکہ ثابت ہوا اور جماعت اسلامی کے حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ جماعت اسلامی کی جانب سے سرکاری طور پر جناب بھٹو کے اس بیان کی پر زور تردید کی گئی اور جماعت اسلامی اور اس کے زیر اثر اخبارات و جرائد نے جناب بھٹو کے اس "مذموم بیان" پر کڑی نکتہ چینی کی اور انہیں خوب طعن کیا گیا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے چند دنوں کے بعد جماعت اسلامی کے بنگلہ ترجمان روزنامہ "سنگرام" میں ایک رپورٹ چھپی جس میں واضح طور پر اعتراف کیا گیا تھا کہ جماعت اسلامی نے اپنے کارکنوں کو رضاکار فورس میں شامل کرنے کے علاوہ "البدر" کے نام سے ایک نیم فوجی تنظیم قائم کی ہے جو مکتی باہنی کے خلاف زبردست مہم چلا رہی ہے۔ اس اخبار میں یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ مشرقی پاکستان جماعت اسلامی کے امیر پروفیسر غلام اعظم نے رضاکار فورس کے ایک تربیتی کیمپ کا معائنہ کیا اور رضاکاروں سے خطاب بھی کیا ان دو باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی اس وقت مشرقی پاکستان میں بھارتی ایجنٹوں اور وطن دشمنوں کے خلاف مہم چلانے کے دوران کیا کردار ادا کر رہی ہے

روزنامہ "سنگرام" نے ۱۱ دستمبر ۷۱ء کی اشاعت میں اپنے اسٹاف رپورٹر مقیم جمال پور کے حوالے سے جو شائع کیا ہے اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

جمال پور ۱۱ ستمبر (اسٹاف رپورٹر) البدر ایک حیرت انگیز نام ہے جہاں نام نہاد مکتی باہنی ہوتی ہے البدر وہاں موجود ہوتا ہے جہاں شر پسند ہوتے ہیں وہاں البدر کے جوان پہنچ جاتے ہیں بھارتی ایجنٹوں اور مداخلت کاروں کے لئے البدر کی حیثیت عزرائیل جیسی ہے ۲۲ اپریل کو جمال پور میں پاکستانی فوج کے قدم رکھنے کے بعد میمن سنگھ ضلع اسلامی جمعیت طلبا کے صدر جناب محمد اشرف حسین کی قیادت میں البدر فورس قائم کی گئی۔ البدر تنظیم ایک قطعی رضاکارانہ اور غیر سرکاری تنظیم ہے اس میں صرف قرآن پاک پر یقین رکھنے والے پاکستان نواز نوجوان شامل ہیں جو بھارتی ایجنٹوں مداخلت کاروں اور شر پسندوں

باقی صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ فرمائیں

مزدور، کسان اور طلبہ ہشت نگر کے کسانوں کی جدوجہد کی حمایت کرتے ہیں

صوبہ سرحد کے کسانوں پر انسانیت سوز مظالم کی داستانیں آئے دن اخبارات کی زینت بنتی رہی ہیں۔ محنت کش طبقے پر یوں تو پورے ملک میں ظلم و استبداد کے سنگدلانہ وار ہو رہے ہیں، کارخانوں میں مزدوروں کی چھانٹیاں اور زمینوں سے کسانوں کی بے دخلیاں اپنے عروج پر پہنچ چکی ہیں، لیکن ملک کے شمالی مغربی صوبے میں خصوصاً کسانوں پر زندگی اجیرن کر دی گئی ہے، وہاں پر کسانوں نے منظم ہو کر جاگیردارانہ استبداد کے خلاف احتجاج کیا ہے، اس وقت صوبہ سرحد میں انیس ہزار مزارعین پر مقدمات قائم ہیں، ساڑھے تین ہزار مزارعین جیل کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں اور بہت سے مزدور کسان رہنماؤں کو جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔ ساٹھ کسان اپنے حقوق کی مدافعت کرتے ہوئے پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں شہادت پا چکے ہیں

لیکن ۳ جولائی ۱۹۷۱ء کا دن صوبہ کے کسانوں پر قیامت بن کر ٹوٹا۔ ضلع پشاور تحصیل چارسدہ میں ہشت نگر کے مقام منڈنی میں مزارعین پر جاگیرداروں اور ان کے پالتو غنڈوں، پولیس اور فرنٹیئر کانسٹیبلری نے چوبیس گھنٹے تک مسلسل فائرنگ کی، جس کے نتیجے میں حکومت کے جاری شدہ اعلان کے مطابق پندرہ کسان شہید ہوئے۔ جس میں ایک عورت اور دو بچے بھی شامل تھے

پاکستان کی تاریخ میں ۳ جولائی ۱۹۷۱ء کو کسانوں کا قتل عام، وہ واحد واقعہ ہے جس میں کسانوں نے شعوری طور پر منظم ہو کر اپنے حقوق کا تحفظ کرنے کی جدوجہد میں اتنی عظیم قربانیاں دیں اور کسانوں کو منظم کرنے کے جرم میں ان کے تمام رہنماؤں جس میں میجر اسحٰق، محمد افضل بنگش، شیر علی باچا، قادر خان، شیر علی بابا، فرید اللہ، لالہ زیارت گل، آدم خان اور بہت سے دوسرے سینکڑوں رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔

ہم مزدور کسان، طلبا، دانشور، فن کار اور باشعور شہری اس اندوہناک اور انسانیت سوز قتل عام کی سخت ترین مذمت کرتے ہیں اور اپنے غم اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے ملک کے تمام محب وطن عناصر سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ صوبہ سرحد میں ہشت نگر کے کسانوں کی جائز اور منصفانہ جدوجہد کی یک آواز ہو کر تائید و حمایت کریں، ہشت نگر کے کسانوں کی عظیم جدوجہد پاکستان میں عوامی جمہوری انقلاب کا ایک مرحلہ ہے اور عوامی جمہوری انقلاب کے لئے جدوجہد کرنے والی تمام سیاسی پارٹیوں، مزدور یونینوں، کسان کمیٹیوں، طالب علم تنظیموں اور دانشوروں کے حلقوں کا یہ اولین فریضہ ہے کہ وہ سب متحد ہو کر انقلابی دوستوں کا ساتھ دیں۔

جس طرح ۱۸۸۶ء میں شکاگو کے مزدوروں نے طبقاتی جدوجہد کی تاریخ میں پہلی بار اتنی عظیم قربانیاں دے کر عالمی انقلاب کی آمد کا اعلان کیا تھا بالکل اسی طرح ۳ جولائی ۱۹۷۱ء کو ہشت نگر کے کسانوں کا قتل عام پاکستان کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے جس میں کسانوں نے طبقاتی شعور سے مزین ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت کی جدوجہد میں اتنی عظیم قربانیاں پیش کر کے، پاکستان میں عوامی جمہوری انقلاب کی آمد آمد کا اعلان کیا ہے۔

ہم سب مزدور کسان، طلبا، دانشور اور فن کار با شعور شہری ہونے کے ناطے ملک کے تمام محب وطن اور ترقی پسند حلقوں اور جماعتوں سے اپیل کریں گے کہ ۳ جولائی ۱۹۷۱ء کے کسانوں کے قتل عام کی عوامی تحقیقات کے لئے عوامی ٹریبونل تشکیل دیں اور اس طرح کسانوں پر خوانین سرحد کے مظالم کا محاسبہ کریں۔

ہم سب شمالی ہشت نگر کے ان جیالے کسانوں کو جو پچھلے ایک سال سے اپنے علاقے میں ایک خوشحال معاشرہ قائم کئے ہوئے ہیں، جنہوں نے اپنے علاقے میں بے دخلیوں کا خاتمہ کر دیا، آپس کے لڑائی جھگڑے ختم کر دیئے، مدرسوں، چوپالوں، اور مسجدوں کا انتظام اپنی قائم کی ہوئی کمیٹیوں کے تحت کیا۔ قتل و غارت گری کو خیر باد کہا، کھیت مزدوروں اور دوسرے استحصال کے شکار مظلوموں سے طبقاتی اتحاد قائم کیا اور اپنے تمام اختیارات عوامی کمیٹیوں کے تحت عوامی عدالتوں کو دے دیا تاکہ مظلوم اور مفلوک الحال کسان، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے گدھوں کی نوچ و کھسوٹ سے محفوظ رہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

ہم سب شمالی ہشت نگر کے ان جیالے کسان انقلابیوں کو جنہوں نے اپنی جانیں قربان کر کے خوانین کے جاگیردارانہ ماحول کو توڑا اور کسانوں کی صدیوں سے جھکی ہوئی گردنوں کو سیدھا اور اونچا کر دیا۔ ان شہیدوں، ان انقلابیوں اور ان جیالوں کو سلام عقیدت و احترام پیش کرتے ہیں۔

ہشت نگر کے شہید کسان انقلابی امر ہیں امر رہیں گے!

ہشت نگر کے کسانوں کی جدوجہد پھیلے گی! پھیلے گی!

طارق انصاری، پیر بخش بلوچ، عمر خٹک، جنرل سیکرٹری سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کراچی، اقبال جتوئی سیکرٹری سندھی ادبی سنگت کراچی، رفیق چوہدری، عبداللہ بلوچ (ایم پی اے) تسنیم الحسن فاروقی سابق جنرل سیکرٹری نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کراچی، معراج محمد خان جنرل سیکرٹری پاکستان پیپلز پارٹی کراچی، حنیف سولجر ناظم اطلاعات پاکستان پیپلز پارٹی کراچی، بصیر نوید سابق جنرل سیکرٹری این ایس ایف لائل پور سید امداد حسین ممبر سندھ صوبائی اسمبلی، احمد علی سومرو ایم پی اے این ڈی خان، حاجی قاسم پٹیل۔ ایم پی اے سندھ، نعیم آروی رکن مجلس ادارت ہفت روزہ "الفتح"، اشرف شاد محمود شام نگران ہفت روزہ "الفتح"، ایم عبدالقادر چیئرمین سندھ آزاد ماروا ڑا اسٹوڈنٹس فیڈریشن، تاج حیدر، نائب صدر پاک ایڈیٹوریل جہتی انجمن، سید سعید حسن ایم پی اے سندھ اسمبلی امان اللہ خان خٹک، وحید مسیح، صدر مزدور کسان پارٹی کراچی ناصر بیگ چغتائی، صدر نوائے طالبہ کراچی، ابن ایوب سندھ متحدہ مزدور کونسل، محمد اکرم، صدر داؤد کاٹن ملز لیبر یونین لانڈھی، محمود، جنرل سیکرٹری پاکستان مشین ٹول فیکٹری ایمپلائز یونین، ڈاکٹر رشید حسن خان صدر نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن، وہاب صدیقی، ڈاکٹر حئی بلوچ ایم این اے، نیپ

اس ہفتہ کی اہم خبریں

ضمنی انتخابات کی تاریخ میں توسیع

اسلام آباد ۲۱ ستمبر: مشرقی پاکستان میں قومی و صوبائی انتخابات کی تاریخ میں ترمیم کردی گئی۔ اب یہ انتخابات ۱۲ دسمبر سے ۲۳ دسمبر تک ہوں گے۔ پہلے ۲۵ نومبر سے ۲ دسمبر کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔

تائیوان کو خارج کرنے کی قرارداد

واشنگٹن ۲۱ ستمبر: امریکی دفتر خارجہ کے ترجمان نے کہا ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کو ویٹو کے اختیارات کے ساتھ سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت دلانے اور تائیوان کو اقوام متحدہ سے خارج کرنے کا فیصلہ دو تہائی اکثریت سے کرنے کے سلسلے میں دو قراردادیں تیار کرلی گئی ہیں۔

دو چین کے نظریے کی تجویز مسترد کر دی گئی

نیویارک ۲۳ ستمبر: اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے رواں سالانہ ایجنڈا تیار کرنے والی رہبر کمیٹی نے امریکہ کی پیش کردہ دو قراردادوں کی صورت میں دو چین پیدا کرنے کی تجویز مسترد کردی امریکی حکومت نے عوامی جمہوریہ چین کو اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کا رکن بنانے اور اس کے ساتھ ساتھ تائیوان کو اقوام متحدہ سے خارج کرنے کا طریق کار متعین کرنے کے لئے دو تہائی اکثریت کی حمایت کی شرط پر دو الگ الگ قراردادیں پیش کی تھیں اور رہبر کمیٹی سے مطالبہ کیا تھا کہ اس کی دونوں پیش کردہ قراردادیں البانیہ کی طرف سے پیش کردہ قرارداد سے منسلک کی جائیں۔ رہبر کمیٹی نے امریکی تجویز سے انکار کا فیصلہ ووٹوں کی اکثریت سے کیا۔

پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے فیصلے

کوئٹہ ۲۴ ستمبر: پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں جو آج یہاں شروع ہوا۔ مطالبہ کیا گیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ضمنی انتخابات کے بعد دسمبر سے پہلے بلایا جائے، ملک کی سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی ہٹائی جائے۔

قومی اقتصادی کونسل کا فیصلہ

اسلام آباد ۲۴ ستمبر: قومی اقتصادی کونسل نے چوتھے پنجسالہ منصوبے کے لئے تقریباً سولہ ارب اٹھارہ کروڑ روپے کے صنعتی سرمایہ کاری کے شیڈول کی منظوری دے دی، شیڈول میں ایسی صنعتوں کے فروغ پر زور دیا گیا جس سے برآمدات میں اضافہ اور درآمدات میں کمی ہو سکے، انجینئرنگ کی صنعت کے فروغ کو ترجیح دی گئی۔

دو چین کی تجویز امریکی سامراج کی پیدا کردہ ہے

ہانگ کانگ ۲۵ ستمبر: پیکنگ کے اخبار پیپلز ڈیلی نے واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ چین کو اس وقت تک عالمی ادارے سے کوئی دلچسپی نہیں جب تک اقوام متحدہ میں دو چین کی نمائندگی برقرار رکھی جائے گی۔ چین نے امریکی قراردادوں کی مذمت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ یہ صدر نکسن اور جاپانی وزیر اعظم ساتو کی ملی بھگت ہے چین ایسی کوئی تجویز قبول نہیں کرے گا۔

بقیہ: الفتح انکشاف

کا مقابلہ کر رہے ہیں اس کا مقصد پاکستان کی سالمیت اور اسلام کی حفاظت ہے۔ جمال پور سب ڈویژن میں البدر نے ابھی تک سات کیمپ قائم کئے ہیں اور اس نے مختلف اوقات میں بھارتی مداخلت کاروں اور شرپسندوں کا مقابلہ کرکے نہ صرف متعدد شرپسندوں اور مداخلت کاروں کو ہلاک کیا بلکہ ان میں سے بہت سوں کو گرفتار کیا اور ان کے قبضہ سے بھاری مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود برآمد ہوا مذکورہ بالا رپورٹ سے دو باتیں ثابت ہوجاتی ہیں اول یہ کہ جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم اسلامی جمعیت طلبا نے البدر قائم کی جو ایک نیم فوجی تنظیم ہے جس کا مقصد بظاہر شرپسندوں اور وطن دشمنوں کے خلاف مہم چلانا ہے لیکن جماعت اسلامی کے کارکن اپنے حریفوں کو قتل نہیں کرتے ہیں اس بارے میں دعوے سے نہیں کہا جا سکتا ہے اس سے یہ تو ظاہر ہوگیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں رضاکار فورس کے علاوہ جماعت اسلامی کی ایک اپنی نیم فوجی تنظیم البدر موجود ہے جو سرگرم عمل ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مارشل لاء کے تحت کسی فوجی یا نیم فوجی تنظیم کا قیام غیر قانونی ہے اور اسلحہ کے ساتھ اس قسم کی تنظیم قائم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ پھر جماعت اسلامی کی ذیلی شاخ نے خواہ اس کے مقصد کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو کس طرح اس قسم کی تنظیم قائم کی جناب بھٹو کی جانب سے جب الزام لگایا گیا کہ جماعت اسلامی رضاکار فورس کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہے تو اس کے خلاف زبردست واویلا بھی مچایا گیا اور یہ جواز پیش کیا گیا کہ رضاکار فورس براہ راست امن کمیٹیوں کے زیر نگرانی قائم ہوئی ہے جس میں مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندے شامل ہیں اس لئے اس کے جماعت اسلامی کی جانب سے استعمال کئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے لیکن گذشتہ ۱۵ اور ۱۹ ستمبر کے روزنامہ سنگرام ڈھاکہ میں اس کے اپنے اسٹاف رپورٹر کے حوالے سے جو خبر شائع ہوئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان جماعت اسلامی کے امیر پروفیسر غلام اعظم نے محمد پور کے فیزیکل ایجوکیشن سنٹر میں رضاکاروں کے ایک کیمپ کا معائنہ کیا اور وہاں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "رضاکار فورس میں کسی جماعت کے کارکن کم ہیں اور کس جماعت کے کارکن زیادہ ہیں اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہے سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ ایک پاکستان پر یقین رکھتے ہیں اگر کسی سیاسی جماعت کے لیڈر کو اس بات پر حسد ہے کہ رضاکار فورس میں ان کی جماعت کے کارکن کم ہیں تو رضاکاروں کو ان باتوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے"۔

ایک سیاسی لیڈر کی جانب سے حکومت کی نگرانی میں قائم ہونے والی ایک نیم فوجی تنظیم کی تربیت گاہ کے معائنے کے لئے جانا اور صرف جانا ہی نہیں بلکہ رضاکاروں سے مخاطب ہو کر سیاسی تقریر کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جماعت اسلامی نے رضاکار فورس میں بڑی تعداد میں اپنے جماعتی کارکنوں کو بھر دیا ہے اور انہوں نے رضاکاروں کے اجتماع میں جو کچھ کہا ہے اس کا اشارہ دوسری سیاسی جماعتوں کی جانب ہے جن کے رضاکار فورس میں جماعت کے مقابلہ میں کم کارکن ہیں" جو بقول غلام اعظم جماعت اسلامی سے حسد کرتے ہیں"! جماعت نے کس طرح رضاکار فورس پر اپنا تسلط قائم کر لیا ہے کیا اسے ثابت کرنے کے لئے مزید دلائل اور شواہد کی ضرورت ہے؟



قارئین کہتے ہیں

ہمارے ہاں معیاری فلمیں کیوں نہیں بنتیں؟

ہماری چوبیس سالہ فلمی صنعت جوانی کی منزل میں قدم رکھنے سے پہلے ہی بڑھاپے کی منزل پر گامزن ہے ان چوبیس برسوں میں ہماری فلمی صنعت نے کہاں تک ترقی کی ہے؟ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

ابتدائی دور میں ہماری فلمی صنعت کو سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ہندوستانی فلموں کی نمائش پاکستانی فلمی صنعت کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس اعتراض کے پیش نظر فلمی صنعت نے ہندوستانی فلموں پر پابندیاں عاید کرنے کے لئے حکومت سے شدید احتجاج کیا بلکہ ایوان صدر تک پہنچنے کے لئے فلمی صنعت سے وابستہ تمام افراد نے لاہور سے راولپنڈی تک پیدل سفر طے کیا۔ اس جدوجہد میں فلمی صنعت کی بعض ممتاز شخصیتوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جن میں سید شوکت حسین رضوی سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی، اداکار سنتوش کمار اور ڈبلیو زیڈ احمد پیش پیش تھے۔ آخر انہی شخصیتوں کی جدوجہد سے حکومت کو ہندوستانی فلموں کی نمائش پر پابندی عائد کرنی پڑی۔ ہندوستانی فلموں پر پابندی عائد کرنے کے بعد حکومت اور عوام کو یقین تھا کہ اب پاکستانی فلمی صنعت کی ترقی اور معیار میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ عوام کو اعلٰے معیاری اور قومی موضوع پر بننے والی بہترین فلمیں دیکھنا نصیب ہوں گی۔ لیکن افسوس جو کچھ سوچا تھا ہوا اس کے برعکس۔ جونہی ہندوستانی فلموں کی نمائش ممنوع قرار دی گئی تو ہمارے بعض نئے نئے فلمسازوں نے بھارتی فلموں کے چربے بنانا شروع کردیئے اس کے ساتھ ساتھ پنجابی اور اردو فلموں کا دور دورہ بھی شروع ہوگیا۔ اگر دیکھا جائے تو ہماری فلمی صنعت کی ابتدا دراصل پنجابی فلموں ہی سے ہوئی تھی۔ اور ہندوستان سے آئے ہوئے بعض مشہور فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے پنجاب کے ماحول سے متاثر ہوکر کثرت سے پنجابی فلمیں بنانا شروع کردیں۔ ان فلم ۔ دن نے ابتدا میں پنجاب کی گزری ہوئی تمام حقیقی لوک داستانوں کو فلمانا شروع کیا۔ جن میں "ہیر رانجھا، سسی پنوں، سہتی مراد، سوہنی مہینوال وغیرہ قابل ذکر فلمیں تھیں۔ فلموں کی تعداد میں تو اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مگر فلموں کا معیار قائم نہ ہوسکا۔

تقسیم ملک کے بعد عوام نے جس طرح ہر صنعت کی ترقی میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اسی طرح فلمی صنعت کی ترقی میں بھی گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ جب بھی کوئی نسبتاً معیاری فلم عوام کے سامنے آئی انہوں نے دل کھول کر داد دی۔ اور ہر طرح سے ہمت افزائی کی۔ مگر افسوس! اس کے باوجود ہماری فلمی صنعت وہ حیثیت اور معیار حاصل نہ کرسکی جو آج دنیا کی تمام دوسری فلمی صنعتوں کو حاصل ہے۔ ہماری فلمی صنعت ابھی تک حکومت کے تعاون سے بھی محروم ہے۔

آج ہماری فلمی صنعت کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اداکاروں کے بڑھتے ہوئے معاوضے ہیں اور اس المیہ کی پوری پوری ذمہ داری فلم سازوں اور اس کے بعد تقسیم کاروں پر عاید ہوتی ہے۔ ہمارے اکثر فلم ساز جب بھی کوئی فلم بناتے ہیں تو نہ کہانی کی طرف توجہ دیتے ہیں نہ موسیقی کی طرف اور نہ ہی ہدایت کاری کا کچھ خیال رکھتے ہیں۔ ان کی سب سے پہلی اور اہم خواہش یہی ہوتی ہے کہ فلم کی کاسٹ بہت بڑی ہو اور اسی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ بڑے بڑے اداکاروں کے پیچھے یوں بھاگتے پھرتے ہیں جیسے وہی ان کے خدا ہوں۔ بڑے اداکاروں میں بھی یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ فلمساز ان کے بغیر کوئی فلم نہیں بنا سکتے اور فلم سازوں کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ آئے دن اپنے معاوضوں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ فلم ساز کے بعد دوسری ذمہ داری اس تقسیم کار پر عائد ہوتی ہے جو فلمساز سے فلم خریدتے وقت سب سے پہلا سوال یہ کرتا ہے کیا فلم میں محمد علی، ندیم، وحید مراد، شمیم آرا، شبنم یا دیبا وغیرہ ہیں؟ یہ سوال انکے لئے پریشانی کا سبب ہے۔

(انور حسین انور ۱۲ فردوس نگر لاہور)

خواتین کے مظالم پر بھی کچھ لکھئے

ویسے تو آپ دنیا بھر کی مظلوم اقوام کی حالت زار کے متعلق ہر ہفتے کوئی نہ کوئی مضمون شائع کرتے رہتے ہیں لیکن پشاور کی تحصیل چارسدہ میں خوانین جو خونی ڈرامہ کھیل رہے ہیں ان کی ہمدردی یا ان کی حالت زار کے متعلق آپ کے رسالہ میں ابھی تک کوئی مضمون یا اداریہ شائع نہیں ہوا۔ ستمبر تک کی جو تلوار لٹک رہی تھی اب تو وہ بھی ہٹ گئی۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کو اس کا علم نہ ہو، آئے دن اس علاقے کے متعلق اخبارات میں کچھ نہ کچھ شائع ہوتا ہی رہتا ہے۔ مزدور کسان پارٹی کے لیڈر افضل بنگش، میجر اسحاق وغیرہ بغیر کسی مقدمہ کے جیل میں بند ہیں۔ عوام کی ترجمانی کا دم بھرنے والے کسی اخبار یا رسالے نے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کی کہ ان کا قصور کیا ہے۔ کیا کسان اور مزدور اسی طرح استحصال کی چکی میں پستے رہیں گے؟ کیا ان کی زندگی اسی طرح اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے گذر جائے گی۔ یا کبھی ان پر بھی آزادی کا سورج طلوع ہوگا۔ جب سے الفتح جاری ہوا ہے۔ میں نے سب رسالے پڑھنے چھوڑ دیئے ہیں، اس رسالے کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس میں وہی مواد شائع ہوتا ہے جو کہ مظلوم کے دل کی آواز ہے اور میری یہی کوشش رہی ہے کہ اپنے واقفوں میں زیادہ سے زیادہ اس رسالے کو متعارف کراؤں، میں نے اس رسالہ سے بہت سی امیدیں وابستہ کررکھی ہیں، پاکستان کے غریب عوام کو اس رسالہ کے ذریعے کچھ امید کی کرن نظر آتی ہے کہ کبھی تو ہم پر بھی بہار آئے گی۔ لیکن آپ کی تنگی کے کسانوں کے متعلق خاموشی نے میرے دل کو بہت صدمہ پہنچایا ہے۔ کیا آپ کے قلمی معاون فارغ بخاری آپ کو اس علاقہ کے حالات کی اطلاع نہیں دیتے، یا آپ نے اس کے متعلق ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔ آپ اپنے رسالہ کو کراچی کے حالات تک ہی محدود نہ رکھیں، بلکہ سارے پاکستان کو مدنظر رکھا کریں۔ اگر پشاور میں آپ کا کوئی نمائندہ نہیں ہے تو پہلی فرصت میں اپنا نمائندہ مقرر کریں۔ تاکہ اس علاقہ کے حالات کی رپورٹ آپ تک پہنچتی رہے۔

آپ کے رسالہ کے معاونین میں ابراہیم جلیس کا نام بھی رقم ہوتا ہے۔ لیکن ان کی کوئی تحریر مستقل طور پر شائع نہیں ہوتی اگر گیارہویں صفحہ کے لئے بارواں صفحہ ابراہیم جلیس کے لئے وقف

ہیں تو نہلے پہ دہلا کا محاورہ کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔

افضل صدیقی کے سلسلہ وار مضمون "روزنامہ غالب سے روزنامہ جنگ تک" بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ بعض ہفتہ جو آپ اس سلسلہ کا ناغہ کر دیتے ہیں تو بہت کوفت ہوتی ہے۔

عبدالسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۰۔ پشاور

نوٹ:۔ صوبہ سرحد میں خواتین کے ظلم وستم کے بارے میں کئی مضامین شائع کئے جا چکے ہیں۔ الفتح کے شمارے اس بات کی گواہی دیں گے کہ ہم نے حق گوئی سے کبھی منہ نہیں موڑا۔

—— (ادارہ)

عظیم قائد ہوچی منہہ پر مضمون شائع کریں

میں الفتح کا مستقل قاری ہوں، الفتح کی جرأت اور بیباکی سے معاشرتی ناسوروں پر نشتر زنی قابل تحسین ہے۔ سرمایہ داروں، جاگیرداروں کو جس انداز سے الفتح بے نقاب کر رہا ہے۔ وہ غریب مزدوروں اور محنت کش عوام کے دل میں ایک نئی روح پھونکنے کے مترادف ہے، مزدوروں کی بیباک ترجمانی اور بلند ہمتی سے نوکر شاہی کو ہدف تنقید بنانے پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آخر میں ایک گذارش کرونگا کہ آپ کسی آئندہ اشاعت میں ہوچی منہ کی زندگی کے مختصر حالات ان کی کسی اچھی سی فوٹو کے ساتھ شائع کریں۔ اس کے لئے بھی آپ کا شکر گذار ہوں گا۔

(احسان اللہ۔ داؤد لوٹا)

بقیہ: کھیل

یا یورپی فارورڈ کا مقابلہ کر سکے۔

فارورڈ لائن:۔ فارورڈ لائن میں وہ تمام کھلاڑی موجود ہیں جنہوں نے بنکاک کے ایشیائی کھیلوں میں بھارتی کھلاڑیوں کو ناکوں چنے چبوا دیا تھا۔ سنٹر فارورڈ میں سب سے مضبوط کھلاڑی رشید جونیئر موجود ہے اشفاق اور اسد ملک میں اب پہلے جیسی پھرتی موجود نہیں رہی۔ شاید ان کی عمر کی وجہ۔ اسد کس حد تک سود مند ثابت ہو سکتے ہیں لفٹ ان میں اصلاح الدین، اشفاق کی جگہ لے سکتا ہے۔ اصلاح الدین میں کہیں زیادہ طاقت اور اسپیڈ موجود ہے۔ وہ سنٹر فارورڈ رشید کا بہترین معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

بہرحال جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب تو تنقید سے بھی کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ کیونکہ قومی ٹیم کے کھلاڑی منتخب کئے جا چکے ہیں ہماری اور پوری قوم کی نیک تمنائیں ٹیم کے ساتھ ہیں۔ اس امید میں رہیں گے کہ پاکستان کی ٹیم جب بارسلونا سے واپس آئے گی تو تیسرا بین الاقوامی اعزاز اپنے ساتھ لائے گی۔

بقیہ: دوائیں مہنگی ہو گئیں

میں بات چیت کا مرحلہ ایک دو نشستوں میں ختم نہ ہوا۔ درآمد کنندگان اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرانا چاہتے تھے۔ مگر حکومت اپنے موقف پر سختی سے ڈٹی ہوئی تھی۔ درآمد کنندگان کے نمائندوں کا قافلہ اسلام آباد پہنچ گیا ڈائریکٹر ہیلتھ سے ملاقات کی گئی۔ بعض دوسرے اہم لوگوں سے بھی ملاقات کا بندوبست کیا گیا اور آخر میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ "اگر فیصلے پر خاطر خواہ نظر ثانی نہ کی گئی تو ہم ادویات کی درآمد مکمل طور پر بند کرنے پر مجبور ہوں گے۔" یہ نسخہ خاصا مؤثر تھا۔ حکومت یہ بات جانتی تھی کہ اگر درآمد کنندگان نے اس دھمکی کو عملی جامہ پہنایا تو اس سے ادویات کی قحط پڑ جائے گی جس کا نتیجہ بہرحال خوشگوار نہ نکلے گا۔ چنانچہ نئی پالیسی کے اعلان تک یکم دسمبر ۱۹۷۰ء کی خوردہ قیمت میں ۵ فیصد سے لیکر ۱۵ فیصد کا عارضی اضافہ منظور کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ حکومت پر زور دیا گیا کہ چونکہ بونس واؤچر اسکیم کے تحت باہر سے منگائی جانے والی دوا پر زیادہ اخراجات اٹھیں گے اس لئے نئی پالیسی میں درآمد کنندگان کے مفاد کا خاص خیال رکھا جائے۔ بصورت دیگر وہ ادویات درآمد کرنا بند کر دیں گے۔

ادویات پر اضافہ شدہ قیمتوں کے بارے میں عام تاثر معلوم کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ لانڈھی میں رہنے والے ایک ڈاکیہ کریم اللہ نے بتایا "منافع خوری ہماری زندگی میں رچ بس گئی ہے۔ دواؤں کی مہنگائی اس کی بدترین مثال ہے۔ پچھلے مہینے میری بیوی حاملہ تھی۔ اسے ٹیکہ لگانے کی ضرورت تھی۔" کریم اللہ نے نسخہ نکال کر دکھایا۔ نسخہ پر جکٹوفر JECTOFER لکھا تھا۔ کریم اللہ نے بتایا "اس ٹیکے کی قیمت ۲۰ روپے بتائی گئی۔ اب آپ ہی بتایئے ایک غریب آدمی جس کی کل ماہانہ تنخواہ ۹۰ روپے بنتی ہے صرف انجکشن پر ۲۰ روپے کہاں سے خرچ کر سکتا ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ منافع خوری کے اس بڑھتے ہوئے رجحان کی سرکوبی کرے۔ ورنہ ہمارے جیسے غریب آدمیوں کے لئے پاکستان کی زمین تنگ ہو جائے گی۔"

لیاقت آباد میں رہائش پذیر ایک سرکاری ملازم قدرت اللہ نے بتایا۔ "انگریزی دواؤں کے بارے میں سوچتے ہیں، استعمال نہیں کرتے۔ استعمال کیسے کریں۔ دوا جیسی بنیادی ضرورت کو ایک خاص طبقہ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اچھی اور اعلیٰ قسم کی دوائیں وہی لوگ استعمال کر سکتے ہیں جن کے پاس دولت ہے۔ میرا ۶ سال کا ایک لڑکا ہے۔ بچپن سے بیمار رہتا ہے۔ جسمانی طور پر کمزور ہے۔ سرکاری ڈاکٹر معمولی دوا دیتا رہا۔ مجبور ہو کر ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے طاقت کا ایک انجکشن لکھ دیا۔ شاید اس کا نام نیوروبیا NEUROBIA ہے۔ ۹۰ روپے میں ۲۰ انجکشن ملتے ہیں۔ ڈاکٹر کو نسخہ لکھے ہوئے ایک ماہ ہو گیا ہے مگر میں ابھی تک انجکشن نہیں خرید سکا۔"

سروے کے دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض انتہائی ضروری دوائیں بڑے مہنگے داموں میں ملتی ہیں۔ ان کی قیمتیں کم ہونی چاہئیں۔ تاکہ خاص وعام بوقت ضرورت ان سے استفادہ کر سکیں۔ ٹی بی کی ایک دوا —— MYAMBUTOL-INJ کی قیمت ۵۰ روپے ہے سانس کی ایک دوا LEDERCORT ۳۳ روپے میں ملتی ہے اور بلڈ پریشر کی دوا ALDA-CTONE-A ۳۰ روپے میں ملتی ہے۔ کراچی جیسے صنعتی شہر میں ٹی بی، بلڈ پریشر اور سانس کا مرض عام ہے۔ لیکن مذکورہ دواؤں کی قیمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ عام آدمی نہیں خرید سکتا۔ دوسری طرف خیراتی اسپتالوں اور شفاخانوں میں اتنی مہنگی دوائیں مریضوں کو نہیں دی جاتیں۔ خاص خاص آدمیوں کو سفارش پر دی جاتی ہیں۔ غریب آدمیوں کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں رہ جاتا کہ وہ مرض کی شدت اور تکلیف برداشت کرتے کرتے دم توڑ دیں۔

گذشتہ ماہ نئی پالیسی کا اعلان ہونا تھا۔ ہو سکتا ہے۔ نئی پالیسی میں حکومت نے درآمد کنندگان کے موقف کو تسلیم نہ کیا ہو۔ اور دوا کے حصول میں عوامی پریشانیوں کا خیال رکھا گیا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوا اور نوکر شاہی کا ہتھکنڈا کارگر ہو گیا تو پھر ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دوائیں عام شہریوں کی قوت خرید سے باہر ہوں گی۔ اس کے استعمال پر پاکستان کے متمول طبقہ کی اجارہ داری ہو گی۔ غربت اور افلاس کی چکی میں پسنے والے عام لوگ اسی طرح دوا کے بغیر فٹ پاتھ پر دم توڑتے رہیں گے۔



چاند نہیں ہوا (مولانا تھانوی) —— چاند ہوگیا (مولانا الازہری) —— خبر



مشرقی پاکستان میں کنونشن وقیوم لیگ میں سنگھم ہوگا کہ نہیں — ؟

—— ہوگیا ——

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
30, SEPT – 7, OCT, 1971

ٹی سی پی

تجارتی رموز سے خوب واقف ہے





ٹی سی پی بیرونی تجارت میں بے حد احتیاط سے کام لیتی ہے۔ درآمد ہو یا برآمد، اس کی نظر ہمیشہ کوالٹی پر رہتی ہے۔ یہی سبب ہے، کہ بہترین خرید و فروخت کے لئے ٹی سی پی دنیا بھر میں مشہور ہے۔

ٹی سی پی کی خدمات یوں تو سب کیلئے وقف ہیں لیکن غیر روایتی مصنوعات کی برآمد کے لئے یہاں چھوٹے اور اوسط درجے کے تجارتی اداروں کو خاص مراعات دیجاتی ہیں۔

اپنی برآمد کو فروغ دینے کے لئے ٹی سی پی کو خدمت کا موقع دیجئے۔

ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ

پریس ٹرسٹ ہاؤس، آئی – آئی۔ چندریگر روڈ —— کراچی
ڈھاکہ —— چٹاگانگ —— کھلنا —— لاہور —— پشاور



HAQQI OFFSET PRESS, LIAQUATABAD, KARACHI